Presentation Copy

Ram Babu Saksena

Delhi
12.8.1947

قمک
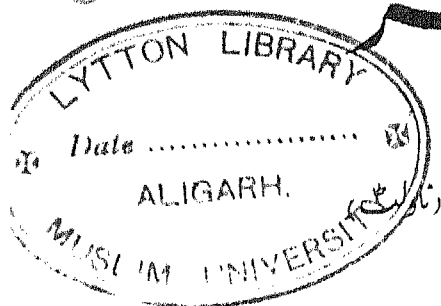
خواجہ محمد شفیع

مطبوعہ

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن
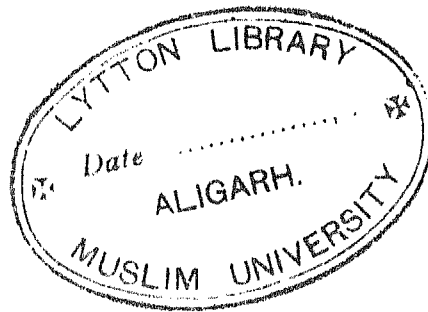
خواجہ محمد شفیع

ہندوستانی پبلشرز دلی

مئی ۱۹۴۶ء

طبع اول

قیمت
عہ

تعداد اشاعت
۱۰۰۰

سول ایجنٹس

نگارستان ایجنسی، اردو بازار دہلی
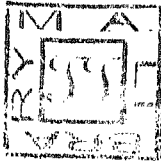
میں بچپن ہی سے نمود و نمائش کی دلدادہ تھی۔ روز نیا جوڑا
پہن کر پڑوس میں ایک ایک کو دکھاتی پھرتی تھی۔ بڑی لڑکیوں کی
دیکھا دیکھی بالوں میں پھول لگا آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے کو پہروں
گھورا کرتی۔ پھر دیکھنے والوں کی نظریں دیکھا کرتی۔ گھر میں آنے جانے
والے جو مجھے خوب صورت کہتے، میں ان کے لئے پان سگرٹ
دوڑ دوڑ کر لاتی، جو میری طرف التفات نہ کرتے، ان سے دل
ہی دل میں گھٹتی — ابھی خیر سے بسم اللہ بھی نہیں ہوئی تھی، جزو
میں بستہ بغل میں دبائے دبائے پھرنے لگی۔ سبق شروع ہونے
کے بعد کا تو ذکر ہی کیا، ہر آئے گئے کے آگے کتاب کھول بیٹھتی
اور جھوٹ موٹ بتاتی کہ ہم نے یہ بھی پڑھ لیا اور یہ بھی۔ غرض یہ کہ جس

طرح ممکن ہوتا میں اپنے کو بڑھا چڑھا کر دکھاتی، اور ہمہ وقت یہی چاہتی کہ مجھ پر نظریں پڑیں، سب میری تعریف کریں ---- گھر میں نہ تو میرے اس جذبہ کو دبانے کی کوشش کی گئی، نہ صحیح راستے پر ڈالنے کی۔ رفتہ رفتہ طبیعت اس سانچہ میں ڈھل گئی۔

اب میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر اس وقت صحیح پرداخت ہو جاتی تو شاید یہ پودا بار آور ہوتا۔ پروان چڑھتا ---- یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ماں باپ چاہنے والے نہ تھے، وہ تو جان چھڑکتے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ دل کے آگے دماغ کی چلنے نہ دیتے تھے، اور کچھ دماغ سے کام بھی کم لیتے تھے ---- اماں نے مامتا کے مارے کبھی سختی نہ کی اور وہ غریب یہ جانتی بھی نہ تھیں کہ اس وقت کی ذرا سی کجروی ساری عمر کو صراط مستقیم سے ہٹا دے گی۔ آبا نے ادھر دھیان نہ دیا غرض کہ ہم اللہ جھیرے کی طرح پلے۔ طبیعت خود رو پودا تھی۔ دست ادب آموز سے محروم، نہ بیکار ٹہنیاں چھانٹی گئیں، نہ صحیح کھاد ملی خیابا بندی تو در کنار کسی مالی نے سہارا دے کر سنبھالا بھی نہیں۔ جدھر جھکا گئی جھک گئی۔ صانع قدرت نے کوئی شے بیکار نہیں بنائی۔ اس پودے میں بھی کام کی کلیاں تھیں، مگر ان سے کام نہ لیا گیا۔ یہ نہال بھی زینت دہ چمن بن سکتا تھا۔ لیکن تربیت کی کمی نے تخیل

بیابانی بنا دیا — پانی کی بوندیں سیپی کی آغوش میں دُرِ آبدار بن جاتی ہیں۔ اور گندی نالی میں وجہ عفونت۔ تربیت ہی بناتی ہے تربیت ہی بگاڑے۔

ننھے منے بچپن میں مجھ پر کوئی خاص روک ٹوک نہ رہی۔ یہ تو نہیں کہ کوئی بری صحبت تھی۔ اچھے گھروں میں اس کا کام کیا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ طبیعت کی افتاد دیکھ کر اسے صحیح راہ پر نہ ڈالا گیا۔ ہلکے نقوش عمر کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے چلے گئے۔ اب میں خیر سے چودہ پندرہ کی تھی، جو اماں کے ساتھ شادی بیاہ میں آنے جانے لگی، اچھا خاصہ بڑا کنبہ، روز مرہ کے بلاوے۔ میری یہ ضد کہ ہر مرتبہ نیا جوڑا پہن کر جاؤں، اور وہ بھی بھاری، ماں باپ چاہنے والے تھے، پیسہ کی کمی نہ تھی، جو کہتی وہ ہو جاتا۔ صورت شکل کی ہزاروں میں ایک، اس پر قیامت کا بناؤ سنگھار۔ محفل میں سب کی نظر مجھ پر پڑتی۔ اور میں اسی کی طلب گار تھی۔

ابھی سولھویں سال میں قدم رکھا تھا کہ چاروں طرف سے نسبتیں آنی شروع ہو گئیں۔ یوں تو جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔ اور پھر میرا تو پوچھنا ہی کیا تھا۔ اچھی لڑکی، اونچے گھرانے کی۔ ماں باپ کی اکلوتی، ساری جائداد کی وارث۔ لوگوں

نے گھر گھیر لیا۔ آج نواب وراثت علی خاں کے ہاں کی ماما برقع پھڑکاتی آ رہی ہے۔ توکل میاں کالے کی ددا آن دھمکی، وہ گئیں تو نئی سبتی کی ڈولی ڈیوڑھی میں دھری تھی، غرضکہ ڈومنی، کٹنی، مشاطہ اناء، دوا کھلائی کون تھی جو نہ آئی اور کہاں کہاں سے نسبتیں نہ لائی۔

ابا شروع شروع تو ٹالتے رہے۔ ہر ایک سے یہی کہہ دیتے کہ ابھی لڑکی چھوٹی ہے، دیکھا جائے گا۔ ایک دن اماں نے سمجھایا کہ بادشاہ وزیر بیٹیوں کو نہ بٹھا سکے۔ ہم کیا بیچارے ہیں۔ یہ پرایا دھن ہوتی ہیں۔ پالا پوسا حوالہ کیا۔ جگہ جگہ سے نسبتیں آ رہی ہیں تم ہو کہ کہیں حامی ہی نہیں بھرتے۔ قمر جہاں سترھویں میں لگے گی۔ شادی بیاہ کی یہی عمر ہے۔ ہماری مانو تو اچھا گھرانا دیکھ کر اللہ کے بھروسے پر ہاتھ پکڑا دو۔۔۔۔ یہ باتیں سننے کے بعد ابا کا رویہ بدل گیا، اور بجائے ٹکا سا جواب دینے کے یہ کہہ دیتے تھے کہ اچھا دیکھا جائے گا۔ چند روز بعد جواب دوں گا۔
لکھنؤ سے مرزا لاڈلے کی والدہ خود آئیں۔ لڑکے کی تصویر ساتھ لائیں۔ ہم نے بھی چوری چھپے دیکھ لی، نازک اندام، گلرو جوان ہزاروں لاکھوں میں ایک، پوتڑوں کا رئیس، جاگیروں پرگنوں کا

مالک ان کی والدہ لال حویلی کرایہ پر لے کر رہیں۔ دو تین مرتبہ ہمارے ہاں بھی آئیں۔ میں نے بھی جھریوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ بڑی نخلتہ کی بیوی تھیں۔ بلے چاری کوئی پندرہ دن یہاں پڑی رہیں، پر ابا کسی عنوان نہ مانے، اور یہی کہا کہ پردیس میں تو لڑکی کو بیاہوں گا نہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہلوایا کہ آپ تحریر لے لیں۔ ہر دوسرے مہینے لڑکی میکے آئے گی۔ پندرہ دن رہ کر چلی جائے گی۔ لیکن ابا کے منہ سے جو ایک دفعہ نا نکلی تو پھر ہاں کی ہی نہیں۔ بعد میں میں نے اڑتی اڑتی یہ بھی سنی کہ ان کے نسب میں بھی کچھ فرق تھا، اور طوائف کا میل۔

غرضکہ وہ مایوس واپس گئیں، اور خدا معلوم کیوں کچھ اس کا مجھے بھی رنج ہوا۔ بار بار تصویر آنکھوں میں پھر جاتی، اور سینے پر سانپ سا لوٹ جائے۔ کچھ دن کھانا اچھا نہ لگا۔ سنگھار سے بھی دل بیزار سا ہو گیا۔ لیکن جوانی کا زخم جلد ہی بھرتا ہے، اور یہ تو تصویر و تصور ہی تک محدود تھا۔ قصہ مختصر ابا نے بڑی اونچی اونچی نسبتیں واپس کر دیں، اور ان کی نگاہ مرزا سرفراز پر پڑی۔ یہ ہڈی بوٹی سے درست، اجلے پوش، شریف زادے تھے۔ والدین گھر داماد دینے پر راضی ہو گئے ــــ ان کے ہاں کی عورتیں

بات پکی کرنے آئیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق سامان لائیں۔ چپ چپاتے نسبت ہو گئی۔ میرا دل امتیاز طلب، مجروح ہوا۔ بھلا میری نسبت اور ایسی جگہ۔ پر کیا کرتی۔ کنواری بچی کے منہ پر قفل پڑا ہوتا ہے ـــــ بہرکیف قہر درویش بر جان درویش نسبت کے دو ماہ بعد میں اپنی تمنا اور طبیعت کے مطابق دھوم دھڑا کے سے کسی رئیس کے گھر جانے کی بجائے ایک متوسط الحال شریف زادے مرزا سرفراز کے حوالے کر دی گئی۔

جب تک میاں کو بیوی پر ہر طرح تفوق نہ ہو الرجال قوامون علی النساء کا اطلاق کما حقہ نہیں ہوتا۔ اور اس کے بغیر ازدواجی زندگی میں استقامت رہ جانے لازمی۔

میری نظروں میں سرفراز کی حیثیت پہلے ہی پست تھی ہم دونوں کا مناکحت کی ارتقائی منازل تک پہنچنا قرین قیاس نہ تھا ـــ ہمارے ہاں ایک زچہ گیری ہے جس کے بول ہیں:-

"میرے سر کا تاج یوں بولا۔ یوں بولا ری وہ تو۔ یوں بولا۔ میرے سر کا سرتاج یوں بولا"۔ اب بھی جب یہ الفاظ سنتی ہوں تو اپنی زندگی میں اس شخص کی کمی محسوس کرتی ہوں جسے میں اپنے سر کا سرتاج کہہ سکتی۔ گھر میں میاں کی حیثیت بادشاہ کی ہے، دوسرے

سب مشیر کار، جب تک کہ وہ مطلق العنانی کے ساتھ مقتدر نہ ہو، خاندان کا نظام صحیح عنوان کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔

شاہ کا زچ ہونا بازی کا ہرنا ہے۔ میاں کا دباؤ کھانا گھر کا بگڑتا ہے — ابتدا میں، چند روز کے لئے میں خانہ پری کے طور پر سرفراز کے گھر جا رہی۔ تمام سسرال والے آنکھیں بچھاتے مگر میرے مزاج کو کسی طرح نہ پاتے، سرفراز نے بھی دلداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن میرے خانہ دل میں گھر کر نہ سکا — نہ سسرال والوں نے خاطر داری میں کمی کی، نہ سرفراز نے ناز برداری میں۔ لیکن میری تیوری کے بل صاف نہ ہونے تھے نہ ہوئے۔

وہاں کا کھانا مجھے بھاتے نہیں۔ گھر پسند نہ آئے۔ کوٹھی سا غسل خانہ، نہانا عذاب۔ ہر بات پر ناک بھوں چڑھاؤں۔ ہر چیز میں کیڑے ڈالوں، میاں والوں کو حقیر سمجھوں۔ منہ تھتھاتے اپنے کونے میں پڑی رہوں، ساس نندیں واری صدقہ، دلہن بیگم کے کھالوے ہی نہیں۔ سب کا بیوی بیوی کہتے منہ سوکھے۔ پر مجھ پر کچھ ایسا اپھارا چڑھا جو اترا ہی نہیں۔ ایک ایک بات کی اماں سے شکایت کروں — کلبلا سا گھر، کنبہ بڑا۔ نندوں کے بچے نیند حرام کر دیتے ہیں۔ کھانے میں مرچیں زیادہ ہوتی ہیں۔ پانی کے

مٹکے بھی گندے۔ بچے دن بھر ہاتھ گنگولیں۔ ناشتہ میری مرضی کے مطابق نہیں ملتا ــ غرضیکہ وہاں کی کوئی شے مجھے ایک آن نہیں بھاتی تھی، اور میں روزانہ نئی بات آکر اماں سے لگاتی تھی۔ ـــ انجام کار سسرال والے بھی جھک گئے، اور ایک روز جب اماں نے پانی کے گندے اور بدبودار ہونے کی جھوٹی شکایت پر گھر سے صراحی بھجوائی تو ان غریبوں کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اور میرے سسر کی بھی تیوری پر بل آیا، بیٹے کو اپنے پاس بلایا، اور دیر تک کچھ کہا سنا۔ اس رات سرفراز نے مجھ سے پوچھا کہ "اماں جان نے صراحی کیوں بھیجی تھی"! میں نے کہا "خبر نہیں" ـــ بہرنوع وہ مرد تھا اور میں عورت، گو اسے دل میں حقیر جانتی تھی تاہم غیر ارادی طور پر اس کا رعب مانتی تھی چہرہ کی تمتماہٹ دیکھ کر میں دم بخود سی ہوگئی۔ وہ یہ جواب سنکر تھوڑی دیر تو خموش بیٹھا رہا لیکن یہ سکون اٹھنے والے طوفان کی خبر دے رہا تھا اور میں دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ اماں سے سنا تھا کہ مرد کا غصہ برا ہوتا ہے ـــ تھوڑی دیر سکوت کے بعد وہ یوں بولا "دیکھو بیگم اس طرح ہماری تمہاری نباہ نہیں ہوسکتی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے تم آئی ہو، سارا گھر خاطر مدارات میں لگا رہتا

ہے، دلہن دلہن کہتے سب کا مُنہ سوکھتا ہے، لیکن دلہن بیگم کسی سے سیدھے مُنہ بات ہی نہیں کرتیں۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن شریف ہیں اور اپنی عزت کو عزیز رکھتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کی مامائیں بھی تمہاری دیکھا دیکھی ہر چیز پر نام دھرتی اور ناک بھوں چڑھاتی ہیں، اول تو ہم کو تمہارے لئے روز روز وہاں سے خاصہ لگ کر آنا بھی ناگوار تھا۔ آج یہ اور طرّہ ہوا کہ بیگم کے لئے پانی بھی گھر سے آیا ہے۔ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ ہم ان ہتک آمیز حرکات کی تاب نہیں لا سکتے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ صراحی اماں جان نے خود بھیجی تھی، یا تمہاری کسی شکایت کی بنا پر ایسا کیا گیا ——" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا، میں دم بخود بیٹھی رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا "تم سُن رہی ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں؟" اس پر بھی جب میں نے جواب نہ دیا، تو اس نے سختی سے میرا بازو پکڑ کر ہلایا اور ترشی سے کہا "بیگم میں کتا نہیں ہوں جو بھونکے جاؤں؟" بتاؤ یہ حرکت تمہارے کہنے سننے سے کی گئی ہے یا تمہاری اماں نے خود ایسا کیا ہے"—— گھر کی پلی ہوئی کیسی ہی ضدّن اور سخت مزاج کیوں نہ ہو، مرد کے غصّہ کے سامنے اس کی چل نہیں سکتی، اور میرے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا "میں نے

تو کچھ بھی نہیں کہا۔ اماں نے خود کھینچ دی ہوگی۔" اس پر وہ خموش
ہو گیا، لیکن یہ وہ موسلا دھار برسنے والی گھٹا تھی، جس میں کڑک
چمک نہ ہو۔ اور میرا سفینۂ حیات اس طوفان کے تھپیڑوں میں ڈانوا
ڈول ہو گیا ــــ قصہ مختصر ابتدا سے کچھ ایسی افتاد پڑی کہ ہماری
نباہ نہ ہو سکی۔ انجام کار یہ قرار پایا کہ ہم اپنے گھر خوش، تم اپنے
گھر خوش۔ نہ تم کو ہم سے مطلب، نہ ہم کو تم سے واسطہ۔

ابا کے لئے یہ امر سوہانِ روح تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر گھلنے۔
اماں بھی پریشان رہنے لگیں، میرا مزاج ایک دن سے ایک دن
چڑچڑا ہوتا گیا۔ والدہ غریب بھی ناز برداری کرتے کرتے تھک گئیں۔
کچھ اس غم نے انہیں وقت سے پہلے ڈھا دیا۔ اکثر بھی خواہوں نے
بیچ میں پڑ کر سرفراز کو راضی کرا کر میل ملاپ کرا دیا۔ لیکن اس مصالحت
کو کبھی استقامت نہ ہوئی، اور ہم دونوں گردشِ زندگی بھی ایک دو
ماہ سے زیادہ یکجا نہ رہ سکے۔ طبائع میں بعد المشرقین تھا۔ نیز میری
طبع انتہا زطلب کو زک پہنچ چکی تھی۔ محفل میں جب کسی بڑے آدمی کی
بیوی کو دیکھتی، دل ہی دل میں ایک ننھا سا کھٹک جاتا، اور مجھے سرفراز
کی صورت بری سے لگنے لگتی۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں وہ قصور وار نہ
تھا، میری طبیعت کا رجحان اس غریب کو کیا معلوم تھا۔ لیکن میں مجبور

تھی۔

مجھے یاد ہے آخری مرتبہ نواب شمس الدین خاں نے بڑی کوشش سے میل ملاپ کرایا۔ ابا نے بھی اماں کی معرفت مجھے سمجھوایا کہ "بیٹا شریفوں کی بیٹیاں مرتی ہیں اور بھرتی ہیں۔ اب کافی جگ ہنسائی ہو چکی ہمارے بوڑھے چونڈے پر رحم کرو، اور جس طرح بن پڑے نباہو۔ زمانہ بھر تمہارے میکے آن بیٹھنے پر انگشت نما ہے۔ ہمیں یہ غم زندہ درگور کئے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری بہتری بھی اسی میں ہے۔ ہم چراغ سحری ٹھیرے آج مرے کل دوسرا دن۔ پھر تمہاری اور تمہاری جاگیر جائداد کی رکھوالی کرنے والا سوائے سرفراز کے کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ بھی برا نہیں ہے، اور تم سے محبت کرتا ہے۔ کچھ وہ گتی کرے، کچھ تم دل پر جبر، یہ میاں بیوی کا رشتہ تو ہے ہی نکتا۔ کبھی ہم نے سہہ لی، کبھی وہ سہار گئے۔ اسی طرح عمریں گذرنی ہیں —" یہ باتیں سنکر میں نے بھی سوچا کہ اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا میں اس کے ساتھ بندھ چکی۔ وہ میرا بن چکا ہے، خواہ مخواہ دو زندگیوں کو تباہ کرنے سے کیا فائدہ۔ موہوم خواب کے پیچھے حقیقت کو برباد کرنا کس نے اپنے نباہا ہے۔ اس کے علاوہ سہیلیاں اپنے میاؤں

کے ذکر اذکار کرتیں، تو مجھے چپ ہونا پڑتا، نیز محفلوں میں مجھ پر انگلیاں بھی اٹھنے لگی تھیں، اور اکثر شوخ طبع سرگوشیاں بھی کرتیں۔ "مارنے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے، کہنے کی زبان نہیں روکی جا سکتی۔" دنیا باتیں بنانے لگی۔

ایک محفل میں مجھے خاص طور پر ان تیغ زبانوں کے زخم کھانے پڑے، میں بلبلا بلبلا گئی، مگر کوئی چارۂ کار نہ تھا، خود کردہ را چہ علاج۔ آج چار سال شادی کو ہو چکے تھے۔ اور میں میاں سے چھوٹی میکے میں بیٹھی تھی، لوگوں کو شبہ کرنے کی گنجائش تھی، اور باتیں بنانے کا حق اور میری بہنیں، اس حق کو کبھی نہیں چھوڑا کرتیں۔ انہیں تو موقع ملنا چاہیئے، پھر اللہ دے اور بندہ لے ——— سر شام گئی تھی رات تک نگاہیں دیکھتے دیکھتے اور بولیاں ٹھولیاں سنتے سنتے سینہ چھلنی ہو گیا۔ میں نکّو بنی بیٹھی رہی۔ آخر خدا خدا کرکے جب کہیں رات کو مردانہ میں محفل شروع ہوئی، اور ہم سب بھی گانا سننے چھت پر چلمنوں کے پیچھے جا کر بیٹھیں تو میرا پنڈ چھوٹا۔

محفل اندر کا اکھاڑا بنی تھی۔ لکھنؤ بنارس کے طائفے آتے تھے، شہر کی بھی چوٹی کی طوائفیں جمع۔ شریف گھرانوں کے اکثر و بیشتر نوجوان مدعو تھے، پان سگرٹ گردش میں۔ بجلی کے

فانوس روشن۔ ملازمان باتمیز کمربستہ ستونوں سے لگے کھڑے تھے۔ ایرانی اور تورانی قالینوں کا فرش۔ صدر میں مسند۔ مسند پر دولہا! چاروں طرف احباب ہال میں لئے بیٹھے تھے۔ پرانی وضع کے ڈنڑ پیل کسرتی جوان انگرکھے پہنے دوشالہ اوڑھے تشریف فرما۔ کچھ انگریزی خواں سوٹ بوٹ میں ملبوس۔ بعض ہم ٹرشیروانی زیب بر کئے متمکن تھے۔

جب کسی کا میاں محفل میں آتا تو بیوی چلمن کے پیچھے چھپ سی جاتیں سکھیاں مذاق اڑاتیں۔ اللہ رے مشرقی حجاب۔ تیس چالیس گز پرے میاں آیا۔ پردے کے پیچھے بیوی کی جبین تاز پر پسینہ آگیا۔

اتنے میں سرفراز دالان میں داخل ہوا۔ سب کی نظریں کچھ پڑ تھیں۔ گو میں بے تعلق سی بیٹھی رہی۔ لیکن دل کا مالک اللہ ہی تھا۔ مختلف جذبات طلاطم برپا کر رہے تھے، چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا۔

سرفراز بدصورت نہ تھا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ہزاروں لاکھوں میں ایک تھا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ سو دو سو میں اس جیسا دوسرا نہ ملتا۔ بنا ہوا بدن۔ تیکھی چتون۔ کٹیلی آنکھ، سجیلا جوان۔ اگر دن کے سپاؤں سے برا تھا تو ہیں کے میاؤں سے لاکھ درجہ اچھا۔

لیکن میں کیا کرتی۔ دل امتیاز طلب صورت کے ساتھ مرتبت کا بھی طلب گار تھا۔

کبھی خیال آئے کہ اس کے ساتھ نہ بندھی ہوتی تو شاید کسی رئیس کی بیگم بنتی۔ اور پھر مجھے سرفراز کی صورت بری لگنے لگتی۔ گاہ خفیف جذبات پر چھا جاتی، اور وہ ایک مردانہ ادا سے بیٹھا اچھا لگنے لگتا۔ بہر نوع پھر پھر کر میری نگاہیں اسی پر پڑتیں۔ چونکہ اس محفل میں وہی ایک تھا جس کو میں ان حالات میں بھی اپنا کہہ سکتی تھی۔

محفل میں جب وہ آیا تو سلام کو ہاتھ اٹھے۔ اکثر نے اسے پاس بٹھانا چاہا۔ دولہا نے اشارے سے قریب بلایا، اور مسند پر جگہ دی جس کو میں بہ نظر حقارت دیکھتی تھی۔ اس کی عزت ہوتے دیکھ لی۔ ابھی ان آنکھوں کو اور بہت کچھ دیکھنا تھا۔

سرفراز کے آتے ہی اہل بزم ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ میں سمجھی کہ جو عورتوں میں مجھ پر بیتی مردوں میں وہی اس پر بیتی، مردوں میں وہی اس پر پڑی۔ لیکن خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم شرفا کے خانگی معاملات۔ بعض بحث میں نہیں لاتے۔ یہاں تو رنڈی مد نظر تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کر لیا کہ بڑھتی نگاہیں ایک طرف تو سرفراز پر پڑ رہی تھیں، اور دوسری طرف ایک نوخیز طوائف پر

مجھے سرفراز سے قطعاً کوئی تعلق خاطر نہ تھا۔ لیکن اس فضا سے
کچھ افسردہ خاطر سی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی زیور جو مجھے
پسند نہ آیا ہو دوسرے کے گلے میں دیکھ کر دل کہے کہ ہے تو
اچھا۔ پھر خیال آئے کہ میرا رد کردہ ہے کبھی سوچوں لے لیتی تو اچھا
تھا، پھر دل منع کرے کہ، میری بارگاہ کا مردود و شدہ ہے۔

ابھی تک راز داں نگاہیں راز درون پردہ دیدہ آشکارا
کر رہی تھیں، کہ شہر کے مشہور پھوٹے بھاگ ٹاڈا پھوڑ نواب مٹن نے کہا
"بھئی سرفراز یہ مشتری بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھیں
اور کیوں نہیں صاحب" دل ملے کی ہے یاری دروغ؟" ——
یہ حضرت ذرا دور بیٹھے تھے، اور خیر سے گلا بھی پھٹا ڈھول تھا
پر سب اس درجہ بلند آواز سے فرمایا کہ ساری محفل نے سنا اور
چلمن کے پیچھے تک آیا۔

سرفراز محفل شناس تھا فقطاً التفات نہ کیا۔ ایسا بن گیا
جیسے روئے سخن اس کی طرف تھا ہی نہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔
لیکن عورتوں میں یہ صدا تھی جو ہنگامہ صدا بصحرا نہ بن سکی۔ بلکہ
تنگ دلوں کی گھاٹیوں سے ٹکرا ٹکرا کر بازگشت کرتی، اور میرے
دل پر بجلیاں گراتی رہی —— دور کی بات نہیں کہہ سکتی۔ کیا یا نہیں

ہو رہی تھیں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ بیشتر سرفراز بول رہا تھا، اور اہل بزم اس کی بات کان دھر کر سنتے اور محظوظ ہوتے تھے۔

اتنے میں مُجرا شروع ہوا۔ موقع محل سے داد دل رہی تھی۔ کبھی کبھی فقرے بھی ہوتے جاتے تھے لیکن اتنے مختصر کہ گانے میں حارج نہیں آتے تھے۔ نواب بنّن صاحب ایک آدھ مرتبہ بجر طوائف میں ہنکارے سوا ان کی یہ تدبیر کی گئی کہ ایک دوست کو مسلط کر دیا۔ ادھر انہوں نے منہ کھولا، ادھر اس نے دہن مبارک پر ہاتھ رکھا۔

ایک دو چیزوں کے بعد طوائف نے یہ ٹھمری شروع کی۔

روٹھے سیاں کو آج منا لائی رے میں منا لائی رے ہاں منا لائی رے

روٹھے سیاں کو آج ۔ ۔ ۔ ۔

میں بھی تباہ حال ہوں تو بھی ہے بیقرار آ پھر نکال لیں کوئی صورت نباہ کی

منا لائی رے۔ میں منا لائی رے

روٹھے سیاں کو آج ۔ ۔ ۔ ۔

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

منا لائی رے میں منا لائی رے

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جواب تلخ می زیبد لب لعل شکرخارا

منا لائی رے ہیں منا لائی رے

لاتے اس بت کو انتخاب کرکے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

منا لائی رے ہیں منا لائی رے

زندگی گاتی بناتی۔ ہر ہر دل کی تصویر بنی جاتی تھی۔ فضائیں سر جھوم رہے تھے۔ دماغوں پر کیف طاری۔ دلوں پر جذبات یوں تو سب ہی پر ایک حالت سی چھائی تھی۔ لیکن سرفراز کی آنکھیں کچھ دل کے افسانے سناتی نظر آتی تھیں۔ اس کا جسم وہاں تھا لیکن روح اس آنکھوں کی راہ اس دنیا سے سکون کی تلاش میں نکل آئی تھی جس سے میں نے اسے محروم کر رکھا تھا۔ دل نے ملامت کی۔ مجھے ندامت ہوئی کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی فاقہ زدہ کی روٹی میں نے چرالی ہو، اور اس کی بھوکی آنکھیں اسے کونے کونے تلاش کر رہی ہوں۔ میں چھپی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ اور ضمیر مصروف شماتت تھا۔

آج سرفراز مجھے برا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ نہیں میں غلط کہہ گئی۔ وہ آج مجھے کچھ اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ عورتوں کی بھی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں۔ مرد اسے آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ تعجب ہے میں نے اسے نظروں سے گرا دیا تھا۔

۲۲

یہ وہ زمانہ تھا جب نواب شمس الدین خاں صاحب جانبین کو سمجھا رہے تھے۔ میں نے بھی اس مرتبہ ارادہ کر لیا کہ سرفراز کے ساتھ نباہنی ہے — ادھر میرے باپ راضی ادھر سرفراز منہ کھولے بیٹھا تھا، سونے پر سہاگہ موتیوں میں دھاگہ۔ طرہ یہ کہ اس مرتبہ میرا بھی عندیہ مطابق ہو گیا۔ نباہ کی صورت نکل آئی۔ اور ہم دونوں پھر یکجا ہوئے۔ اس زمانہ کی یاد اب بھی تڑپا جاتی ہے۔ مجھے اس کی ہر خوشی عزیز تھی، وہ میرا ناز بردار۔ میرا جذبہ امتیاز طلب اس کے پیروں میں لوٹ کر تسلی پاتا تھا۔ ہم کو ایک دوسرے کی باتوں میں مزا آتا تھا، اور ہم گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ جب دنیا بھر کے ذکر ختم ہو جاتے، تو ہم ایک دوسرے کے قریب خموش بیٹھ جاتے۔ لیکن اس سکوت میں بھی ستاروں کا نغمہ تھا، جو سنائی نہیں دیتا، لیکن نظام عالم قائم رکھتا ہے۔ گھر جنت بنا تھا اور ہم آدم و حوا — کہ شیطان نے مجھے پھر انگلی دکھائی۔

ایک جگہ سے پارٹی کی دعوت آئی۔ میں گئی — نہایت پرتکلف چائے تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ لیڈی ماموں نے بیگم شوکت کے اعزاز میں دی تھی۔ سچ یہ ہے کہ یہ ایک معزز بہانہ تھا۔ اصل میں جنگ کے لئے چندہ کی فراہمی مدنظر تھی۔ اتفاق کی بات اسی زمانہ میں

میاں لاڈلے کی اہلیہ بھی دلی آئی ہوئی تھیں یہ وہی لاڈلے ہیں، جن
سے میری نسبت آئی تھی، اور والد نے انکار کر دیا تھا۔ ان بیگم
کے دیکھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اتنے میں کسی نے لیڈی ہاموں
سے کچھ کہا، اور وہ ساری سنبھالتی لپٹر جھپٹر دروازے کی طرف
چلیں۔ معلوم ہوا کہ مرزا لاڈلے کی بیگم صاحبہ کے استقبال کو گئی
ہیں۔ رئیس کی بیوی تھی عزت سے لائی گئی۔ صدر میں بٹھائی گئی
ایک ایک سے ملوائی گئی ـــــ چاء پانی کے بعد چندہ کی فہرست
سب سے پہلے ان ہی بیگم کے سامنے آئی۔ ان کے میاں سر بننے
کے متمنی تھے۔ محترمہ نے ایک لاکھ روپے کی رقم تحریر فرمائی۔
لیڈی ہاموں نے بلند آواز سے اعلان کیا۔ ساری محفل پر سناٹا
چھا گیا۔ سب کی نظریں ان پر پڑ رہی تھیں، تمام بیویاں حیرت
سے منہ تک رہی تھیں۔ میں وہاں سے ٹل گئی۔ ٹہلتی ٹہلتی ایک
طرف کو نکل گئی۔ دل گھبرا رہا تھا، محفل بری لگ رہی تھی۔ رہ رہ کر
یہ خیال ستا رہا تھا کہ آج میں اس کی جگہ ہوتی تو دنیا میرا منہ تکتی
اس وقت یہ رقم میں لکھتی، محفل سے منہ چھپاتے بھاگنے کی بجائے
مرکز نگاہ بنتی۔ سینہ پر سانپ لوٹ رہا تھا، اور میں بے دست و پا۔
ماں باپ مارآستین معلوم ہو رہے تھے، اور ان کی محبت

سنگِ راہ۔

میں سنگ خوردہ کی طرح جھلاتی ۔ بلبلاتی، رات کے نو بجے گھر پہنچی۔ تیوری پر بل، مزاج برہم، سینہ میں طوفان امڈا چلا آرہا تھا۔ اس مرتبہ ملاپ کے بعد آج میں پہلی دفعہ بگڑی بگڑی نظر آئی، سرفراز باتیں کرنے لگا۔ میں نے پارٹی کا حال سنایا، آخر میں بیگم لاڈلے کا ذکر آیا۔ الفاظ میں جذبات نظر آگئے، زبان کام کرتی رہی۔ دل ٹکڑے ہوتا گیا۔ سرفراز چپ بیٹھا سنتا رہا۔ لیکن اس سکوت میں طوفان پنہاں تھے —— آخر کار میں سو گئی۔ خواب کی دنیا میں کیا دیکھا، کیا سنا، کیا کہا، کچھ خبر نہیں۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ دنیا خواب سے بدل گئی۔

صبح سرفراز گھر سے گیا اور پھر نہ آیا۔ سارا خاندان پریشان کہیں پتہ نہیں —— سونی سیج، اکیلا کمرہ۔ راتیں سر پر آئیں۔

آخر محاذ جنگ سے خط ملا۔ لکھا تھا:۔

"تم عزت کی متلاشی ہو، میں اس بازی پر جان لگاؤں گا۔ یہی ایک دولت ہے تمہاری خوشی پر لٹاؤں گا، اوروں کے میاں کاغذ کے پرزے دے کر اپنی بیویوں کے لئے

عزت خریدتے ہیں۔ میں سر دے کر تمہیں
سرفراز بناؤں گا۔"

دن گذرتے گئے، دل کی دھڑکن راتوں کی طوالت بڑھتی گئی۔ آنکھ لگی تو خواب دیکھا سرفراز سرہانے کھڑے مجھے نسیب شے رہے ہیں، دانت لگا یا تو مزا تلخ۔ اب جو دیکھتی ہوں تو ان کا خون آشام سر ہے۔ گھبرا کر آنکھ کھل گئی۔ رات بھر نیند نہ آئی۔

صبح فوجی خط آیا، ان کی شجاعت، دلیری اور بے جگری پر ایک قصیدہ تھا۔ آخر میں پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی۔ اخبارات میں ان کی تصویریں چھپیں، جلسے ہوئے۔ وائسرائن نے مجھے بلایا، ایک تمغہ عطا فرمایا۔ آج میں مرکز نگاہ تھی، لیکن مرکز حیات ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چلتے پھیر میں پڑ گیا۔

"تلاش سرفرازی نے سرو کو بے ثمر رکھا۔ فطرۃ آپ نے آبرو چاہی، فیصد صدقے نصیب ہوئی" "تلاش نام نے عنقا کو عزلتیں بخشیں" — "تھا تلاش نشان میں نشان کھو بیٹھا"

یہ چند فقرے کسی رسالے میں میری نگاہ سے گذرے ماضی آنکھوں کے سامنے آگیا، سر چکرا گیا، عالم ہستی فانوس خیال معلوم ہونے لگا، زبان سے نکلا ؎

غبار از خاکساری سر بہ اوج آسماں دارد
حباب از سربلندی پائمالِ موج می گردد

تلاشِ عز و جاہ میں سرفراز کو سر کی بازی لگاتے دو سال گذر گئے، حیاتِ دو روزہ میں انقلاب پر انقلاب آئے، بساط پلٹ گئی، مہرے بکھر گئے۔ دنیا اور سوائے دنیا نے بیسیوں رُخ بدلے، بنے بنائے نقشے بگڑے، خانہ دل اجڑ گیا۔ من کی نگری بغیر شاہ رہ گئی۔

سال بھر کے اندر ماں باپ دونوں اللہ کو پیارے ہوئے جائداد و جاگیر میرے قبضے میں آئی۔ گھر کی بیٹھنے والی کیا خاک انتظام کر سکتی۔ کچھ کارندوں کی دست برد میں آیا، کچھ اغیار نے خرد برد فرمایا۔ دیکھتے دیکھتے آمدنی سو سے پچاس اور پچاس سے پچیس رہ گئی۔ اب میری آنکھیں کھلیں۔ سوچا کہ مرنے والے مر گئے مجھے اپنی گزارنی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو سال دو سال میں ہاتھ جھاڑ کر ہو بیٹھوں گی۔ ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ پیسہ پیسہ کو محتاج ہو جاؤں گی۔

اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ ایک روز کسی اخبار میں مرزا بادشاہ کی تصویر نظر پڑی۔ نیچے تعریف و توصیف میں ایک قصیدہ

لکھا تھا۔ شانِ نزول یہ تھی کہ انہوں نے کسی تعلیمی ادارہ کو پانچ ہزار روپیہ مرحمت فرمایا تھا۔ آنکھیں الفاظ پڑھ رہی تھیں۔ دماغ اپنا کام کر رہا تھا، دل راہیں بنا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر میری جائداد ان سردم خوار کھُل اپاڑ، داروغاؤں کے پنجۂ آز سے نکل آئے، اور اس کا طریقہ سے انتظام ہو جائے، تو ایسے ایسے چندے میں بھی بآسانی دے سکتی ہوں۔ دل نے کہا پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ ایسی حیا کو سات سلام، جس میں آنکھوں دیکھتے گھر لٹوانا پڑے، دنیا دست گیری نہیں کرتی۔ انگشت نمائی کرنے پر آمادہ رہتی ہے، اپنا کام اپنے ہی کئے ہوتا ہے۔ کس کی بھوکی بکری، کون ڈالے گھاس۔ جائداد میری اور دیکھ بھال کریں اور۔ داروغہ ہیبت، باپ دادا کے نمک خوار اپنے ہاتھ رنگتے اور اپنا گھر بھرتے رہے۔ میں بے دست و پا بیٹھی کچھ عرصہ تماشا دیکھا کی۔ جانتی تھی کہ یہ گھر پھونک تماشا ہے، لیکن کرتی بھی کیا۔ گھر کے سب ملازم، ماماییں نمک حرام داروغاؤں سے ملے ہوئے تھے، اور وہ ان کی مٹھی گرم رکھتے۔ تاہم بغیر ہاتھ پاؤں مارے ڈوب جانے والی بھی نہ تھی۔ تنکے کا سہارا لیا، ننوا کو رازدار بنایا۔ اس کی ماں ہمارے ہاں ماما گیری

کرتی تھی، اسے چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئی۔ باپ تھا نہیں۔ مرنے والی آخری وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پکڑا گئی تھی۔ اور یہ کہہ گئی تھی کہ بیوی اب اس کا اوپر خدا ہے، اور پیچھے تم ہو۔ ماں کی ممتا بھری آخری نگاہیں بچے پہ پڑ رہی تھیں اور پھر یہ سہ کے لفظ میرے کانوں میں۔ کچھ دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس کے بعد میں نے ننو کی دیکھ بھال اپنے ذمہ کر لی۔ جب کبھی بیمار سیمار ہوا تو دوا درمن اپنے ہاتھ سے کی۔ وہ بھی میری آنکھیں دیکھتا اب کوئی نو سال کا تھا، اور میرے سامنے اٹھک بیٹھک کا کام کرتا تھا۔

ایک روز ہمت باندھ اسے ساتھ لے شہر کے مشہور وکیل اختر حسین کے کمرے پر جا پہنچی۔ ان کا بڑا نام سنا تھا۔ شہر بھر میں دھاک تھی، دور دور سے مقدمے آتے۔ بڑوں سے سنا تھا: زر بر سر فولاد نہی نرم می شود۔ ننو کا نوٹ ننو کی معرفت دلوایا اور تخلیہ میں مشورہ کرنے کی بابت کہا۔ وکیل صاحب فوراً دوسرے کمرے میں اٹھ آئے۔

شرم زبان پر قفل ڈالے، ضرورت حکم عرض مدعا دے۔ تربیت روکے، مصلحت آگے بڑھائے۔ دماغ کام کرے۔ زبان رکی جائے ـــــ شرم و حجاب کا شہاب ٹوٹ رہا تھا۔

جبینِ فلک عرق آلود، سیرے ماتھے پر پسینہ، جسم ساکت، روح لرزہ براندام۔ رسم و رواج کے دبیز پردے چاک ہو رہے تھے، حقیقت مصنوعی ماحول کا خول توڑ رہی تھی۔ رحم مادر کے طبقات شق کرکے حال برآمد ہو رہا تھا۔ ہمارے وقت مائل بہ پرواز تھا، زمین و آسمان نظر آ رہے تھے۔ حیا کے پردوں میں سے عورت نکل رہی تھی۔ وہ عورت جس نے آدم سے جنت چھڑوائی۔ جو ابلیس کو اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے پسند آئی۔ وہ چتنار جو مرد سے کماتی ہے اور خود کھاتی ہے، جو یک گردشِ چشمِ حیات مرد کو تہ و بالا کر جاتی ہے۔ وہ عورت سینۂ زمین پہ مرد سے پہلے اتاری گئی، اس لئے حقیقی وارث کہلائی۔

ابتدائی الفاظ کا منہ سے نکلنا یوں ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا — طفل کلام طفل اشک بن گیا، اور آغوشِ لب میں مچل گیا۔ ہونٹوں نے ان کو اس طرح چھپا رکھا تھا جیسے کنجشک ہوائی اپنے بچوں کو صیاد سے بچاتے — لیکن ضرورت کی آہنی گرفت اور مصلحت کی نرم سانپ جیسی رینگ رینگ کر راہ پیدا کرنے والی انگلیوں نے ان کو خانہ ذہن سے نکال ہی لیا۔ الفاظ منہ سے جدا ہوتے لیکن کچھ اس طرح جیسے رینگ رینگ

کر راہ پیدا کرنے والی انگلیوں نے ان کو خانۂ دہن سے نکال ہی لیا — الفاظ منہ سے جدا ہوئے، لیکن کچھ اس طرح جیسے بچہ جب مردہ ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ پاتے تو جدا ہو جاتے — لڑکھڑا لڑکھڑا کر گرنے لگے — شاید یہ میری پہلی لغزش تھی — لفظ کے بعد لفظ ماتمی جلوس کی طرح سرنگوں جا رہے تھے جامۂ معنی سے محروم نہ تھے، ورنہ اس پر کفن کا گمان نہ ہوتا تھا۔

نقاب جب پہلی دفعہ الٹی جاتی ہے تو حیا پروردہ روح کی ایک جگر شگاف چیخ کانوں میں آتی ہے، پھر طبیعت عادی ہو جاتی ہے۔ خلاقِ عالم نے اس مرکب من الخطا والنسیان کو گرم و سرد روزگار دیکھنے، تلخ و شیریں چکھنے اور نشیب و فراز میں سے گذرنے کے لیے تخلیق فرمایا تھا، پس مٹی سے بنایا، اور ہر رنگ میں رنگ جانا طینت کر دیا — مٹی میں خاکساری بھی ہے۔ قدموں میں پڑی رہتی ہے اور سرفرازی بھی اس درجہ کہ سر بہ اوجِ آسمان دارد — ہر قالب میں اتر جاتی ہے، ہر حالت میں اس کی گذر جاتی ہے۔ فقیر کے پیروں سے لگی ہے، تاجِ شاہی پر اس کا ذرہ نظر آتا ہے۔

میں بھی مٹی کی بنی تھی۔ نیا ماحول، نئی حرکت، چند سے گراں

گزری، پھر طبیعت اسی سانچے میں ڈھل گئی — وہی بول جو پہلے
آخری قطرات اشک کی طرح نکلے تھے، اب ہونٹوں پر سے کچھ یوں
چھلکتے اور ڈھلکتے آتے، جیسے مینا سے مئے، سلک ریشم سے
موتی، یا پکے ہوئے قندھاری انار سے رس ٹپکے۔ یا دلہن اخلاقی
چھپر کھٹ سے باہر آتے — شرم و حجاب برطرف۔ میں نے
سارا ماجرا کہہ سنایا۔

وکیل صاحب ادھیڑ عمر کے آدمی تھے، سرخ و سپید رنگ
آنکھیں تیز، چہرہ پر ذکاوت، سارا حال سنکر اظہار ہمدردی کیا۔
مدد فرمانے کا وعدہ کیا — داروغہ، منیب، نوکر چاکر سب
دب گئے۔ ایک آدھ کو نکالا، دس پانچ کو دھمکایا، غرضکہ حالات
بدل گئے، معاملات سلجھ گئے لیکن وکیل صاحب میرے دام الفت
میں الجھ گئے۔ ایک شد دو شد، ایں گل دیگر شگفت۔

کچھ کامیابی کا نشہ دماغ کو چڑھا، کچھ آزادی کی ترنگ۔ اس رنگ
میں مزا آنے لگا، اور میں وکیل صاحب سے کچھ اس طرح کھیلنے لگی۔
جیسے بلی کا بچہ اپنے پہلے شکار سے، میرے لئے یہ شغل بیکار رہا
تھا، وہ سمجھے میں دل ہاری۔

کچھ عرصہ وکیل صاحب آتے جاتے رہے، مجھے جائداد کا

کام سمجھاتے رہے، میں نے بھی ڈھیل دی، کچھ کھلینی رہی، کچھ اپنا
کام بھی بناتی رہی، وراثت کا سرٹیفکٹ لیا، سرخط اپنے نام کرائے۔
زمینوں کا داخل خارج ہوا، وکیل صاحب دل دے چکے تھے
تن دہی سے کام کرتے رہے ۔۔۔ میں بھی خاطر تواضع میں کمی نہ
کرتی ۔ اپنے ہاتھ سے کھانے پکا پکا کر بھیجتی۔ اکثر وہ میرے یہاں
آتے۔ یہیں کھانا کھاتے، میں خود اہتمام کرتی، دوسرے کمرے
میں بیٹھی رہتی، کواڑوں کی جھری میں سے باتیں ہوتیں۔ گاہ گاہ
دانستہ طور پر جھلک بھی دکھا دیتی۔ کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے
کچھ اس طرح ہاتھ باہر نکالتی کہ کلائی تک نظر آ جاتی۔ ایک روز غلط
جگہ دستخط کرنے لگی۔ وکیل صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر بتایا، کچھ
دبایا۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا، انہوں نے کاغذ پر نشان کر دیا، اور
کہا جہاں نشان ہے وہاں دستخط کر دیجئے۔ اس روز میں کچھ اکھڑی
اکھڑی سی رہی، زیادہ باتیں نہیں کیں، وکیل صاحب بھی دوسرے
دن نہیں آئے۔ آدمی جس کام کو گیا تھا، اسے بھی ٹال دیا، اور کہا
کل آنا، ایک ضروری کام آیا ہوا ہے۔ میری غرض اٹکی تھی۔ کچھ
کاغذات ان کے پاس پہنچنے تھے اور پھر جائداد جاگیر کے کام
بھی ابھی پورے طور پر قابو میں نہ آئے تھے۔ وکیل صاحب کی

قدم قدم پر ضرورت پڑتی تھی، ان کے بگڑ جانے سے بنا بنایا کھیل بگڑتا نظر آیا۔ میں نے آدمی بھیج کر بلوایا، اپنے ہاتھ سے خط لکھا، آئے تو یہ ہم تھے، ماتھے پر شکن۔ میں نے کبھی کسی کو منایا نہ تھا۔ لیکن غرض بڑی بلا ہے، چکنی چپڑی باتیں بنائیں، ادائے خاص سے شکوے شکایت کئے۔ نہ آنے پر اپنی سراسیمگی کا اظہار کیا، دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا، آپ کی بلا سے کوئی تڑپا کرے، خیر لیا غنیمت ہے، آ تو گئے، صورت تو دکھا دی۔

وہ تو ریشہ خطمی ہو گئے۔ بولے اور جو کسی اور کا بھی صورت دیکھنے کو دل چاہے تو ــــ؟ میں نے سُنی ان سنی کر دی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ پھر پھر کر پھر دہی کہ "ہماری بات کا جواب نہیں دیا؟" میں نے کہا "عدالت کچھ وقت لے گی"۔ پھر اس شعر کے معنے دریافت کئے۔

مَنشیں ترش نواز گردش ایام کہ صبر
گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

انہوں نے جو صاف معنی تھے وہی بتائے۔ میں نے کہا "ہم نے سنا ہے کہ صبر اس شعر میں بالفتح نہیں بالکسر ہے"! فرمایا ہم تو فتح کے طالب ہیں، اس وجہ سے بالفتح پڑھتے ہیں"! میں

نے کہا "کہیں کسر نہ رہ جاتے"۔ بولے "دل کی دنیا زیر و زبر ہو جائیگی"۔
میں نے جواب دیا "وہی پیش آئے گی جو پیشانی میں ہے"۔

---

(۳)

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

مجھے سرفرازی ملی سر کا سردار کھو کر۔ آزادی ہاتھ آئی ماں باپ سے ہاتھ دھو کر۔ دھن دولت پر قبضہ ہوا دولت عصمت پر نظر ڈالنے والے کے پنجۂ ہوس میں پھنس کر۔

وکیل صاحب نے انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑا، اور لگے ہاتھ بڑھانے کچھ عرصہ "تجربوں" میں دل بھرتی رہی اور چھونے نہ دیا سینہ لیکن ان کی جراتیں بڑھتی گئیں۔ میں آنا کانی دیتی رہی، پر تابکے۔

ایک دن سویرے ہی مجھے موٹر میں بٹھا کر کھلے لے گئے۔ ان کے ساتھ اس طرح جانا گو میں پسند نہ کرتی تھی لیکن آن پھنسنے کا سودا تھا۔ غرض دیوانی اٹھی تھی۔

صبح کا وقت ہوا سرسرا رہی۔ شبنم ابھی آغوشِ گل میں تھی کہ وکیل صاحب نے مجھے اپنے قریب کرنا چاہا، ہم اس وقت پل پر تھے، جہاں تختہ باندھ کے پانی روکا گیا ہے ـــــ

لش

فرمانے لگے "پانی کے آگے پاڑ باندھی نہیں جاسکتی"
سامنے پشتہ پر گھاس اگی تھی۔ پانی تیزی کے ساتھ غراتا ہوا نکل جاتا۔ گھاس ہر تھپیڑے کے ساتھ اپنے مرکز یعنی پشتہ کے قریب تر ہو جاتی، ذرا نرمی اور استقامت سے کام لیتی، اپنی جگہ قائم تھی۔ مشفق قدرت مجھے سبق دے رہی تھی ـــــ مرد سیل ہے عورت گھاس۔ اکھڑ گئی تو بہہ گئی پہلو بچا گئی تو رہ گئی۔
میں یہ سوچ رہی تھی کہ وکیل صاحب بولے "آپ نے میری بات کا جواب نہ دیا" ـــــ میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا، وہ پانی میں گر گیا، دو تھپیڑوں میں منتشر ہوا پتی پتی بکھر گئی۔
وہ بولے "دیکھا پھول بہاؤ کی بھینٹ چڑھا"
میں نے کہا "سیل رواں تندخو تھا تیز گام۔ سفینۂ گل اس میں فنا ہو گیا غرق ہو گیا ـــــ لیکن سیل ہمکناری سے محروم رہا۔ ـــــ برخلاف اس کے قطرۂ شبنم تمام شب ہم آغوشِ عروسِ گل رہا۔"
وکیل صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔
مجھے نہ یہ پسند تھے، نہ اپنی عزت دینی پسند۔ گرانے کے وجوہ میں سے ایک بھی موجود نہ تھی۔ اور عورت بلا وجہ

گرا نہیں کرتی ــــ لیکن اس دارِ فانی میں "تلاشِ بقا خود دعوتِ فنا ہے۔

چڑیا طالبِ قوتِ لا یموت میں گھونسلے سے نکلی، باز جھپٹا۔ ــــ مچھلی نے سانس لینے کو سر اُبھارا کہ بگلے نے منہ مارا ــــ زندہ رہنے کی کوشش پیامِ مرگ ہے۔ ہمارا سانس ہماری زندگی کم کر رہا ہے ــــ میں نے عزت کی تلاش کی عزت ہی پر آن بنی۔ ــــ وکیل صاحب نے دست گیری کی، لیکن دستِ طلب بھی ساتھ بڑھایا۔

تاہم اس قادرِ مطلق نے بقا کی راہیں کسی پر مسدود نہیں کیں شیر کو طاقت دی تو لومڑی کو چال سکھائی ــــ بلّی کو دندانِ خون آشام عطا کئے تو چڑیا کو پرِ پرواز ــــ معلمِ ازل نے مرد کو دست درازی سکھائی تو عورت کو بھی نہ دست نہ چھوڑا اُسے بڑھنا سکھایا، تو اسے ہٹنا۔

وکیل صاحب اپنی حد سے آگے بڑھے۔ میں اپنی حدوں میں آ گئی ــــ کچھ عرصہ تو یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ آخر نگاہیں بدلنے لگیں، اور اچھی آنکھوں سے بُری آنکھیں ہوتی نظر آئیں ــــ ــــ میں نے بھی ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی ــــ چشمِ تلاش

مایوس نہ رہی، جو تندہ یابندہ۔

میرے والد کے ایک دوست حکیم صاحب تھے، شہر میں عزت، حکام میں رسائی، چوٹی کے رئیسوں میں ان کا شمار۔ میری چشم عنایت طلب ان پر پڑی ـــــ نوکر کے ہاتھ کہلوا بھیجا کر "طبیعت خراب ہے جس وقت حکم ہو گاڑی بھیج دی جائے۔" جواب آیا گیارہ بجے پہنچ جاؤں گا، سواری کی ضرورت نہیں" ـــــ سوا گیارہ بجے تشریف لائے۔ بیٹھ کر کے بات کی، التفات سے پیش آئے، نبض دیکھی، حال پوچھا۔ میں کچھ بیمار ہوتی تو بتاتی۔ بولی "سر میں چکر آتے ہیں" فرمایا نبض تو بالکل صحیح ہے۔ بہرکیف خمیرہ گاؤزباں چاندی کے ورق میں لپیٹ کر کھا لیا کرو۔" میں نے کہا حکیم صاحب! مجھے تفکرات نے گھیر رکھا ہے، اور کوئی ہمدرد نظر نہیں آتا، آپ اگر کچھ عنایت فرمائیں ـــ بولے میں ہر طرح حاضر ہوں، اتنا سہارا پایا، میں نے سارا قصہ کہہ سنایا ـــــ وکیل صاحب کی ساری باتیں تو کہی نہیں، بس اشارہ کرتی چلی گئی۔

یہ نبض شناس اس کی طبیعت سے واقف تھے، میرے ہچکیاں لے لے کر بیان کرنے سے ـــــ "راز مکتوب بہ بے ربطی

عنوان سمجھا" ـــــــــ خاندانی شریف، تعلقات کا خیال۔ وہ تو آگ بگولا ہو گئے، چہرہ تمتما اٹھا، فرمایا" میں مردود کو تنبیہہ کرا دوں گا۔"

میں ڈری کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے، دلی زبان سے عرض کیا" حکیم صاحب باپ دادا کی عزت دونوں ہاتھوں سے سنبھالے بیٹھی ہوں، ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی، کوئی بات ایسی نہ ہو جائے، جو میری رسوائی کا باعث ہو۔"

دانت پیس کر جواب دیا" اسی خیال سے تو ہاتھ کاٹ دیئے، خیر تم فکر نہ کرو، کام مناسب طریقے سے کیا جائے گا۔ اور آئندہ جب کبھی کوئی بات ہو مجھے کہلوا بھیجو۔"

وکیل صاحب مار آستین تھے۔ مگر میں نے بھی ٹھان لی تھی کہ چاہے آستین ساتھ جائے، مار آستین کو نہ رہنے دوں گی۔ "بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔"

حکیم صاحب کی مداخلت پر وکیل صاحب نے بہت بل بھرے، لیکن بلبلا بلبلا کر رہ گئے ـــــ انہوں نے کچھ ایسا پھن کچلا کہ سر نہ اٹھا سکے۔ ایک آدھ مرتبہ مجھے پیام سلام کہلوایا۔ میں نے جواب نہ دیا۔ اپنا سا منہ لے کر

رہ گئے۔

حکیم صاحب کی میں مشکور ہوں اور تادم واپسیں شکر گذار رہوں گی کہ انہوں نے میری بے لوث مدد کی، نیز ہمیشہ بیٹی کہا اور بیٹی ہی سمجھا۔

میں نے رفتہ رفتہ جائداد اور معاملات پر قابو پا لیا۔ اکثر کارندے بدل ڈالے، تمام و کمال کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کاغذات دیکھ کر خود احکامات نافذ کرتی۔ اکثر گاڑی میں بیٹھ جائداد کی حالت پر بھی نظر ڈال آتی۔ ایک دو مرتبہ اپنے گاؤں میں بھی گئی، زمینداروں سے بات کی، ان کی شکایات سنیں۔ ان کے مطالبات پر غور کیا۔ ان کی تسلی تشفی کی کارندوں کو مناسب ہدایات دیں ــــ غرضکہ اب میں صحیح معنی میں اپنی جائداد کی مالک و مختار تھی۔

دو تین سال اس طرح گذر گئے۔ ماں باپ کی یاد نشہ خود مختاری نے بھلا دی۔ روپیہ کی جھنکار نے سرفراز کا خیال سر سے دور کر دیا۔

مہینہ کے مہینہ مجھے کا کھا آتا۔ میں خرچ میں بھی لاتی۔ اور بینک میں بھی جمع کراتی۔ حکیم صاحب قبلہ کے مشورہ سے

چھوٹی موٹی چند جائدادوں کے بھی سودے کئے۔

اس عرصے میں اکثر زر پرست مردوں کے پیام آئے ایک ایام زدہ ملا نے ایامی پڑھنے کو بھیجی۔ ساتھ ضمیمہ کے طور پر بیوہ کی مناجات بھی تھی۔

ایک شاعر صاحب نے بھی طرح ڈالی۔ میری تعریف و توصیف میں قصیدے لکھ کر بھیجے، لیکن میں گریز کر گئی۔ مجھے آزادی کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی، کسی کا دامن کیوں پکڑتی۔

اب مجھے دولت کا نشہ چڑھا۔ کسی نے کہا ہے ؏

گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

میں تو پھر عورت ذات تھی۔ یہ مئے مرد افگن سر کو چڑھ گئی۔ پیر اپنے مرکز سے ڈگمگانے لگے۔ مرکز نگاہ بننے کے خیالات دل میں آنے لگے — گرگٹ جب آفتاب پر نظر جماتا ہے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے — میری نگاہیں بھی آفتاب شہرت کی طرف جاتی تھیں اور اکثر خیرہ ہو کر رہ جاتی تھیں — جانتی ہوں کہ یہ میدان صرف مردوں کے لئے ہے، پھر یہ جذبہ عورتوں میں ہے کیوں؟ جب اس اشتہا

کو پورا نہ کرنا تھا تو یہ خواہش کیوں دی۔ اس پیاس کو بجھانا نہ تھا، تو طبیعت میں اسے کیوں پیدا کیا۔؟

حقیقت یہ ہے کہ منشار قدرت یہ نہیں کہ عورت گمنامی میں پڑی رہے۔ یہ رواج مرد ساختہ سماج کا ہے ۔ہم بھی انسان ہیں اور آدم کی اولاد۔ تمام فطری جذبات کی حامل۔ نیز مردوں سے کچھ زیادہ، چونکہ حوا سے قریب تر ہیں۔ شہرت طلبی کا جذبہ اکثر سینہ میں اٹھتا۔ قلب و دماغ کو روشن کر دیتا لیکن مجھے اپنا ماحول تاریک نظر آتا تھا۔

اسی زمانہ میں تحریکِ ترکِ موالات زوروں پر تھی۔ اسکول کے لڑکے تعلیم ترک کر رہے تھے، حکام رس خطابات وکلاء پریکٹس چھوڑ رہے تھے، قومی پنچایتیں قائم ہو رہی تھیں ہوا میں آزادی تھی۔ فضا قومی نعروں سے گونج رہی تھی۔ دن رات جلسے ہوتے، جلوس نکلتے، خوش بیان دادِ کلام لیتے، قومی نظمیں وردِ زبان تھیں۔ نعرۂ تکبیر کی آواز در و دیوار سے پیدا تھی، شہر میں ہڑتالیں تھیں۔ کاروبار بند، غریب فاقہ مستی پر کمربستہ تھے، تو امیر نقصان مایہ پر تیار۔

حکومت لغزیدہ پا تھی۔ سیاستِ مغرب پر جذبۂ مشرق

نصرت نصیب ہوتا نظر آتا تھا۔ آزادی کے طالب جیلوں میں جا رہے تھے۔ اخبارات کے صفحے سرفروشانِ وطن کے نام پر سیاہ کئے جا رہے تھے۔ خرد و کلاں پر نشہ سا چڑھا تھا۔ طلبِ آزادی کا سرور گھٹا تھا۔ طوفان تھا، طغیانی تھی، خس و خاشاک، بہے جاتے تھے۔

اس دوڑ میں مرد پیش پیش تھے تو عورتیں بھی کچھ پیچھے نہ تھیں۔ میاں اپنے جسم نذرِ قید کرتے تو بیویاں اپنے بیاؤں کو سپردِ بند۔ مرد صرف جسم بھینٹ چڑھا رہے تھے، تو وہ سرمایۂ روح لٹا رہی تھیں، وہ قید میں جاتے، یہ زندہ در گور ہو جاتیں۔

امیر غریب کی تخصیص نہ تھی، ایک کا کماؤ جاتا، تو دوسری کا سرتاج۔

(۱۳)

آج جلسہ ہے۔ آل انڈیا لیڈرز آئیں گے، بڑا اہتمام ہے، عورتوں کے لئے الگ انتظام ــــ میں اب تک گھر بیٹھی خبریں سنتی اور اخبار پڑھتی تھی، آج دل نہ مانا۔ گاڑی جتوا جا پہنچی۔ پنڈال جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ قدم قدم پر رضا کار کھڑے ہیں۔ قومی جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ میں گاڑی میں سے اتر زنانہ درجہ میں جا بیٹھی۔

صدر صاحب تشریف لائے، آگے آگے یہ، پیچھے اژدہام عام گلے میں کنٹھے، سر پر پھولوں کی بوچھاڑ، دولہا بنے براتیوں کے ساتھ چلے آ رہے ہیں، اور ہیں بھی دولہا۔ عروس آزادی سے ان کی ناخن بندی ہوتی ہے۔ دلہن ابھی نہیں آئی، تاہم جہیز آنے لگا ہے، جس میں شہرت ہے۔ اقتدار اور کچھ رضا کار۔ نہیں کہا جا سکتا کہ نوشاہ کو دلہن عزیز ہے یا جہیز

بہر نوع فی الحال توجیہز ہی سے دل بہلا رہے ہیں۔
——— چاروں کھونٹ وہ نظر ڈالتے ہوئے جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی "منم بلی نا سور" اسٹیج پر آکرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔
نعرہ ہائے تکبیر اور قومی نعرہ یہ یک دگر اس طرح گتھ گئے جیسے کسی مولوی منش کے دل میں خوفِ عقبیٰ و طمعِ دنیا ہم آغوش ہوں ——— زنانہ درجہ میں کچھ ہل چل سی ہوئی۔ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایک بیگم میرے قریب صفِ اول میں لاکر بٹھائی گئیں۔ اب جو آنکھ اٹھاکر دیکھتی ہوں تو مرزا لاڈلے کی بیوی ——— ان بزرگ نے جب قوم کی بازی جیتی دیکھی تو اپنی قبلیاں اور چاک بک نے ادھر آبیٹھے کبھی سر کے طالب تھے، اب سردار قوم کہلوانے کے طلبگار۔
یہ درم و دام دے کر نام کے سردار بن جائیں گے،
ورنہ حقیقی سردار تو سر دار سر دے کر ہی بنتا ہے۔
بیگم لاڈلے کی بڑی آؤ تواضع ہو رہی تھی، کوئی پان کو پوچھتا کوئی پانی کو ——— نہیں کہہ سکتی کیوں، لیکن اتنی بات ایمان کی ہے کہ میں دل ہی دل میں جل ضرور رہی تھی۔

اب جلسہ شروع ہوا۔ بڑی بڑی خواب آور تقاریر سے قوم کو جگایا گیا، حالِ ماضی سنایا اور مستقبل کا سبز باغ دکھایا گیا۔ ہر تقریر میں مقطع کا بند یہ تھا کہ اس چمن زار کو آبیاری درکار ہے۔ اصل میں تو خون سے کی جائے گی، فی الحال زر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کسی نے کہا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست

زر می طلبی سخن درین است

لیکن یہ سخن کسی عالم کا ہے، اور علماء ہی اس کے حقدار۔ ہم عوام تو جان و مال دونوں نثار کرنے آئے تھے۔

چندہ کی فہرست گردش میں آئی۔ ہر ایک نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر رقم لکھوائی۔ زنانہ میں بیگم لاڈلے نے اپنے نام کے آگے بیس[۲] ہزار درج کیا۔ ان کے بعد میرا نمبر تھا۔ میں نے تیس[۳] ہزار لکھا۔ جن کے ہاتھ میں فہرست تھی، انہوں نے ساتھ کی رضاکارہ سے کہا آپ کو پان پیش کرو۔ اور بآوازِ بلند اعلان فرمایا کہ بیگم قمر سرفراز نے تیس ہزار عطا فرماتے ہیں۔ سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ بیگم لاڈلے ماند پڑگئیں۔ دل میں بہت

گھٹیں پر کیا کرتیں۔ انہیں بارگاہِ شوہری سے اجازت بیس[۲۰] ہزار
ہی کی تھی۔ اور میں خود مختار —— تمام فہرستیں صدر کی خدمت
میں پیش ہوئیں۔ چوٹی کے چندے ایک کاغذ پر درج تھے۔

محترم صدر نے فرمایا: "چندہ کی فہرستیں بحمد اللہ طویل
ہیں، لیکن ہمارے سامنے پروگرام بھی لمبا ہے اور آپ کے
اس خادم کا پیٹ بھی نہایت طویل و عریض ہے۔ اسمائے گرامی
پڑھ کر سنانا طولِ عمل ہوگا۔ میں صرف ان صاحبِ خیر اصحاب
کے نام پیش کرتا ہوں جنہوں نے بیش از بیش رقوم عطا فرما کر اس
وقت قوم کی دستگیری فرمائی ہے۔ اس ضمن میں یہ اور عرض
کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم کو ایک پیسہ بھی اتنا ہی عزیز ہے
جتنا ایک لاکھ روپیہ۔ اب میں چند چندہ دہندگان اصحاب
کے نام آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے
کہ مخدرات سے شروع کروں —— خواتین میں سب سے بڑی
رقم مسز قمر سرفراز صاحبہ نے رقم فرمائی ہے۔ میں آپ سے
اجازت چاہتا ہوں کہ ان کی خدمت میں نہ صرف قوم کی جانب
سے ہدیۂ تشکر پیش کروں بلکہ فخرِ قوم کا خطاب بھی —— امید ہے
کہ وہ قبول فرمائیں گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان سے

دریافت کروں"۔ اتنا کہہ کر صدر جلسہ نے ایک پرچہ پر مجھے
لکھ کر بھیجا کہ یہ خطاب اگر آپ قبول فرمائیں تو ہم سب مشکور
ہوں گے۔ میں نے جواب میں صرف اتنا لکھا:۔
"قمر سرفراز اس سرفرازی کا شکریہ پیش کرتی ہے
اور اگر کبھی ضرورت ہوگی تو سر بھی پیش کر دے گی"
یہ الفاظ پڑھ کر سنائے گئے نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے
قمر قوم زندہ باد، تابندہ باد سے پنڈال گونج اٹھا۔ میں مرکز
نگاہ تھی۔ بمبئی لاڈرے میری روشنی میں ایک پرچھائیں بن کر
رہ گئیں ــــ اخبارات نے میری تصاویر شائع کیں۔ بعض
نے حالات زندگی پر روشنی ڈالی۔ اب میں گھر کے اندھیرے
سے صحافتی اجالے میں آگئی۔ نہیں کہہ سکتی وہ تاریکی اعلیٰ تھی
یا یہ روشنی بہتر۔ اتنا جانتی ہوں کہ آخر الذکر جیسی کس دھماکہ خیز
تھی، اور میں اس راہ پر لڑکھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔
میرا ذکر صفحۂ قرطاس پر آیا۔ قرطاس نگار میرے در
دولت پرــــ اس وقت تک ہندوستان کا ماحول
اجازت نہ دیتا تھا کہ عورت سیاست پر چھکے، پس یہ فلک
پیما مرکز سیارگان ثابت ہوئی۔

گو میں لیڈر نہ بن سکی، تاہم میرا اکھڑ لیڈرز کار مند بن گیا۔
— مرد فطری فقیر ہیں اور ان کو ایک تکیہ درکار، جہاں یہ
چار درویش فکر دنیا و مافیہا سے بے فکر سر جوڑ کر بیٹھ سکیں،
اور شغل حال و قال کریں۔

رہبران قوم مستثنیٰ نہیں۔ پیشہ درانہ قیل و قال اور مولویت
کے بعد ان کو ایک ایسے مقام کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں یہ
نہ صرف اپنے جسم کو نڈھال ڈال دیں۔ بلکہ اپنے دل و دماغ
کو بھی مطلق العنان چھوڑ سکیں — ان کی کیفیت اس ایکٹر
کی سی ہوتی ہے جو اسٹیج پر بادشاہ کا پارٹ ادا کرنے کے بعد
جب تھک جاتے تو کسی خاک کے تودہ پر جا لیٹے، اور اپنی
حقیقت سے ہم آغوش ہو کر سکون حاصل کرے — نہ اس
ایکٹر کی خلقت میں شاہی، نہ ان بزرگ کی فطرت میں پیرائی۔
وہ پیٹ کی خاطر تخت نشین ہوا، جو اس کے لئے تختہ
سے کم نہیں۔ یہ تلاش شہرت میں زینت اسٹیج۔

یورپ میں نائٹ کلب ہیں، جہاں یہ سیاسی گدھے
اپنے دل و دماغ پر سے غلاف فطرت لبادے اتار کر اسے
عریاں سستانے دیتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ مقامات سکونِ روح و جسم اول تو ہیں نہیں، اور اگر کچھ ہیں بھی تو ان بزرگوں کی پوزیشن کے قابل نہیں۔ ایک تو ان کا منصب اعلیٰ وہاں جانے میں مانع دوسرے ان کے قلوب انوار الجنح وہاں سکون نہیں پا سکتے۔ مثلاً کسی نفیس الطبع انسان کو اچھی سے اچھی شراب کوڑی پر بٹھا کر خوب پلایئے اسے نشہ نہیں ہوگا۔ برخلاف اس کے تھوڑی سی دیجیے اور صحیح ماحول میں عطا کیجیے سرور ہو جائے گا یعنی یہ پالودہ طبع آلودہ دامن ہوتے نہیں لیکن نفاست و لطافت کے ساتھ ــــ ان کے لئے کسی شریف کا گھر ہونا چاہیئے۔ اچھا ڈرائنگ روم۔ صحبت ناجنس مفقود، ایک آزاد حسین تعلیم یافتہ فراخ تواضع، سخن فہم و نکتہ رس خاتون موجود۔ ــــ قصہ مختصر یہ قوم کا بیڑا پار لگانے والے میرے گھر پہ سا منس گزیں ہونے لگے۔

دولت کی نہ ان کے پاس کمی تھی نہ میرے پاس۔ اچھے سے اچھا فرنیچر بھی آگیا۔ بڑھیا سے بڑھیا کروکری اور کٹلری بھی، کہنے کی بات نہیں۔ ایک دن ایک صاحب نے کٹ گلاس کا واٹر سٹ بھی بھجوا دیا ــــ میں انجان تھی نہیں، لیکن

کچھ شبہ سا اس بات پر ہوا کہ گلاسوں کی ساخت بالکل مختلف، طرہ یہ کہ دو کنٹر بھی ساتھ۔ بنیر بھیجنے والے کے وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر یہ نقرہ درج تھا "کسی خمار آگیں کے لیے"۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر یہ سچ مچ شراب کے ہوتے، اور کل کو میں نے پانی بھروا کر رکھ دیا تو بڑی خفت ہوگی۔ اور خفت اٹھانے کی میں عادی نہ تھی۔ فوراً گاڑی جتوا، ایک صراحی دو گلاس ساتھ لے صدر بازار جا پہنچی ـــ نوکر کو سمجھا دیا کہ شیشہ آلات والے کے یہاں جا کر پوچھیو کہ ایسا سیٹ کتنے میں دیں گے اور باتوں باتوں میں اس چیز کا نام بھی دریافت کر لیجیو ـــ اس طرح مجھے معلوم ہو گیا کہ اسے واٹر سٹ کہتے ہیں، اور ایک اس سے بڑھیا خرید بھی لائی۔ سٹ بھیجنے والے بزرگ شام کو چند احباب کے ساتھ تشریف لائے۔ میں اب تک پردہ کے پیچھے سے گفتگو کیا کرتی تھی۔ سچ پوچھو تو دل کیا باتوں میں دل بھرتی تھی۔

آج ایک نئے صاحب آئے تھے۔ میرا تعارف کرایا۔ ان کا نام حامد بتایا۔ فرمایا بہترین مقرر ہیں، اور انتہائی قوم پرست ـــ میری بھی تعریف کی ـــ

وہ بولے :" بندہ نواز کیا خادم کا تعارف جناب والا اس چلمن سے کرا رہے ہیں" ۔ جواب ملا " جی نہیں ۔ چلمن والی سے " فرمایا ؎

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

"آدَابُ" ——— میں بولی " لن ترانیؔ"

جواب ملا :۔ ؎

میں طور نہیں جو پھنک جاؤں گا
انسان ہوں بار امانت اٹھاؤں گا

خاک اور سنگ کا اک ڈھیر تھا سینا کیا تھا
چاہیئے تھا تجھے پیوست رگ جاں ہوتا

ترچھی چتون ۔ بانکا جوان، سرخ و سفید رنگ ، غلافی آنکھ ۔ کتابی چہرہ ، بوٹا . بات کرے تو منہ سے پھول جھڑیں ٹھوڑی تارہ ، ماتھے چاند ، غضب کی دلبری ، قیامت کی کشش ۔ مرد مقناطیس ہے ، عورت سوئی ۔ قدرے قیل و قال کے بعد میں پردے سے باہر کھنچ آئی ——— جھجک نکل چکی تھی . وکیل صاحب سے باتیں کر چکی تھی ، آنکھ کا

پانی ایک دفعہ ڈھلنے سے بار بار نہیں۔ اب مصنوعی حیا تھی،
بناوٹی شرم — لجائی، شرمائی، باہر آئی۔ سب تعظیماً کھڑے
ہوگئے۔ میں سلامت کر کے بیٹھی — ست پرزنٹ کرنے
والے صاحب جن کو میں آئندہ خاں صاحب کہوں گی۔ بولے
"بھئی حامد تم نے تو کمال کر دیا، جو منزل ہم برسوں میں سر
نہ کر سکے، تم نے منٹوں میں طے کر لی" — اس نے جواب
دیا کہ

وہ اور ہوں گے، رہیں گے جو انتظار حسن بہانہ جو کی
مری نظر وہ نظر ہے جس کو کہا اسے بے نقاب کر دوں

حامد یہ غرور بے جا ہے۔ صحیح کہ فوری سبب تم ہوئے
تاہم میں پہلے سے بے نقاب ہونے کو تیار تھی۔ دل عورت
کا چاہ رہا تھا۔ تاہم پردہ دکھاوا ہو گیا۔
اول تو مجھے یہ پچادر (چادر) بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی
تھی۔ دوسرے ان لیڈروں پر اپنے پورے ہتھیار آزمانے
سے قاصر رہ جاتی تھی — سہرا حامد کے سر بندھا۔ لیکن
حقیقتہً دلہن کی فطرت اسے آرسی مصحف پر مائل کر چکی تھی۔
باتیں ہونے لگیں۔ میں پردہ کے پیچھے سے بلبل کی طرح

چہکتی تھی، پر اب منقار زیر پر بیٹھی رہی۔ خاں صاحب بولے "مینا بولتی کیوں نہیں؟

حامد "یہی کسر ہے، اور بالکسر یہ مینا بن جائیں گی"

میں۔ آپ فتح سے کیوں گریز کرتے ہیں؟

حامد نے کہا "ماشاء اللہ آپ تو بڑی حاضر جواب ہیں واللہ دل کر دل خوش ہو گیا حسن کیف انگیز، چشم خمار آگیں گفتگو مے فروش، آپ تو خیر سے سر آتش نکلیں"

میں بولی "جناب کے تصورات تو میکدہ بدوش ہیں۔ کل ہی خانصاحب نے مجھے ایک داتن سٹ پرزنٹ کیا ہے یہ کہتے ہوئے میں نے گھنٹی بجائی۔ نوا آیا۔ میں نے کہا "ذرا داتن سٹ ڈائننگ روم سے لے آؤ۔ اس کو پہلے سے سمجھا رکھا تھا کہ جب میں منگواؤں تو خاں صاحب والا نہ لائے بلکہ میرا خریدہ کردہ لے کر آئے۔ اس نے ایسا ہی کیا، جب سامنے لے آیا تو میں بولی "بادے دوسرا لا" اس نے وہ تو وہیں میز پر رکھ دیا، اور اس مرتبہ خاں صاحب والا سٹ لے کر آیا ــــ اب دونوں مقابل دھرے تھے۔ میرا یقیناً بہتر تھا۔ حامد نے دونوں کی تعریف کی۔ لیکن میرے والے کی

زیادہ۔ نیز میری خوش مذاقی پر نادر خوش مذاقی کرتا رہا۔

حامد۔ کیا کہئے بہترین کٹ گلاس ہے۔ اور رنگوں کی گھلاوٹ تو رنگینیٔ طبع پر دہری کسی فن کار نے غنچہ و گل قیامت کے بناتے ہیں، ایک کھلتا نظر آتا ہے، تو دوسرا مہک دینے پر آمادہ۔ غلط نہیں جو انہیں تفسیر رنگ و بو کہیئے۔ میں کہتا ہوں کچھ رنگ بھی ہے تو کیا۔

میں۔ "یہ رنگ نرگ باشی کر دیتا ہے"۔

حامد۔ رام رنگی سے زنگ رم کرتی ہے۔

میں۔ یہ رام جب الٹے تو مار بن جائے۔ تعجب ہے اہل خرد اس مار آستین کو پالتے ہیں۔

حامد۔ صاحب شراب سے بشر بنتا ہے۔

میں۔ رہے ناقص فی الاوسط۔ نیز جس کا جزاول شر ہو۔ از آں دوری بہ۔

حامد۔ جناب معاف فرمایئے گا، یہ وہی شر ہے جو شرافت میں ہے۔ یہاں تو آپ نے سمو دیا۔ وہاں آفت کی شرکت نے اور بھی قیامت ڈہائی ہے۔

غرض اس قسم کی طویل رد و قدح کے بعد جام و قدح گردش میں آگئے۔

رہبرانِ ملک و ملت میرے گھر آتے کھل کھیلتے، اپنے
اصلی رنگوں میں نظر آتے، عبا و قبا اتار دی جاتی، زہد و ورع کی
ملمع کاری آب آزر رنگ و آتش دار کی نذر ہو جاتی ——— میرے
گھر کی ہر شام حافظ کے اس شعر کی شرح ہوتی۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

تحریک شد و مد سے جاری تھی، شب و روز جلسے ہوتے
جلوس نکلتے۔ طوفانی حالات میں کشتیٔ قوم کے کھیون ہار میرے گھر
لنگر ڈالتے اور طغیانیٔ طرب و سبیلِ مے میں تفکرات غرق کر دیتے
——— دستی نکلے ہاتھ سے رکھ کر جام اٹھا لیے جاتے۔ قوم پرستی
فضا میں روئی کے گالوں کی مانند اڑتی نظر آتی۔ رندی و مستی
کی گھٹائیں چھاتیں، عیش و نشاط کے مینہ برستے۔

ایک مرتبہ میں چاندنی رات میں حامد کے ساتھ جمنا کنارے
ٹہل رہی تھی، دریا بہہ رہا تھا خس و خاشاک بہا رہا تھا، حامد
نے کہا دنیا بھی ایک سیلاب ہے، جو شے اس کے زد میں آتی
ہے بہہ جاتی ہے۔
میں نے دریا میں ایک کنکری پھینکی، وہ تہہ میں جا بیٹھی، یہ
میرا خاموش جواب تھا۔ حامد مسکرایا اور بولا خاک نشیں ہو کر پاکیزہ
ہوئی، کوئی بلند مرتبہ نہ پایا۔ طلب جاہ بہانی ہے۔
نقش بوریا ہم شکل امواج ہوتا ہے۔ رلے بہتا نہیں، اور
"حباب از سربلندی با کمالِ موج می گردد" ——— وہ ادا شناس
سمجھ گیا تھا کہ میں جاہ طلب ہوں، اور جانتا تھا کہ دامن کشیدہ
رہنا چاہتی ہوں ——— تھوڑی دیر بعد ہم واپس آگئے۔ گھر گلدستہ
بنا تھا۔ ہر بلبل کے ساتھ ایک گل تھا، ہر سرو قامت قمری
در بغل۔
ایک نصرت کے خواہاں انصار ملت، مختار قوم، سرہم
نہ زخم ملک، ایک نرس کو ساتھ لائے۔ یہ یورپ کے تارک ہیں، تارک
نیاز در مغرب و محراب یورپ پہ رکھتے ہیں۔
خدا نخواستہ میں یہ نہیں کہتی کہ تمام و کمال رندان میکدہ

ملت جام و مینا کے پرستار تھے، یا شاہد و ساقی کے گرفتار،
ان میں مستثنیات بھی تھے لیکن گنے چنے ——— جو دختِ
عنب سے بچے تھے وہ لیلیٰ شہرت کے طالب تھے۔ عروسِ
ملت کا طلب گار صفِ اول میں تو کوئی تھا نہیں۔ پس منظر میں
دو چار پس پشت پڑے تھے۔

ایک سیاستِ مدن کے ماہر ملک دھاری تشریف لائے
ان کی صورت بہت موہن تھی۔ سیاہ آنکھیں قوم کو مالوے کی
افیون دے رہی تھیں، ان کے دونوں میٹھے تھے۔ ایک طرف
وائسرائے سے آنکھیں لڑا رہے تھے۔ دوسری جانب گاندھی
جی کے ساتھ چرکا جما رہے تھے۔ گلے میں مسلمانوں کا بیجا خوف
اور ہندو جاتی کی اندھی محبت ٹیکا بن کر نکلی تھی، بیچاروں کو خواب
میں بھی سیل افاغنہ سرحد سے آتا نظر آتا تھا۔ ہلال ماہ بماہ انہیں
خنجر دکھاتا تھا ——— ان کی دھج دیکھ کر میرے منہ سے نکل گیا ؏

باندھی دم لنگور سے لنگور کی گردن

حامد میرے پاس کھڑا تھا، بولا ؏

سر لون کا منہ پیاز کا اچھور کی گردن

میں نے کہا، یہ تو مسیکدہ ملت میں کھٹائی کی پھانک سے کم نہیں۔ خود

پیتے نہیں، اس پر طرہ یہ کہ دوسروں کے نشے بھی اس دھرم مورتی کو دیکھ کر اتر جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک دیرِ شاہوار تاجِ ملت آیا۔ آنکھیں سوتی چور، پھر ان میں لال لال ڈورے۔ زبان سے شہد و شیر کی نہریں بہاتا تھا۔ یہ رتیدلم یزل اپنے ہمراہ ایک لاڈوں کی پالی رانی لایا فرحت بخش و نشاط زا ماحول ان کے گرد و پیش تھا۔ دونوں قریب قریب ہو بیٹھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی دستِ اتصال پسند نے کشمیر کے شالا مار اور نشاط یک جا کر دیئے۔

اب دروازہ اپنی پوری وسعتوں سے کھلا اور علی علی کرتے ہوئے دو بلانِ پیل پیکر آئے۔ ان کے چہروں پر شوکتِ اسلام تھی اور دینِ محمدی کی شان۔ ان میں سے ایک مشاغلِ دماغی و تفکراتِ سیاسی میں کچھ ایسا غرق تھا کہ سر دپا کا ہوش نہ تھا۔ دوسرے میں حسن پرستی کے آثار پائے جاتے تھے، جراثیم نے کم سنی میں طبیعت کے کمزور ہونے پر ان کے زور پکڑنے کا اندیشہ تھا۔

ایک بلند پرواز ذوالجناحِ آتش در بغل آئے۔ آذر کدہ نوبہار ساتھ لائے۔ یہ شخص کھری کہتا ہے۔ چشم دور میں رکھتا ہے

نہ لاگ لپیٹ کرے نہ اندھی تقلید۔ اپنی رائے الگ رکھتا ہے، اور صائب رکھتا ہے۔

میرے ہاں تو روز بزم سجتی ہے لیڈر آتے ہی رہتے ہیں آج ایک اور ہی صاحب آئے۔ ان کا مجھ سے بدیں الفاظ تعارف کرایا گیا کہ بڑے گور کھشا کرنے والے سوامی قسم کے بزرگ ہیں۔ یہ البیلی چھیری بھیا بنگال سے لائے ہیں۔

اس ساحرۂ بنگالہ کے آنے سے وہ خطۂ زلف و چشم زیر بحث آیا اور باتوں باتوں میں راجہ رام موہن رائے کا ذکر چھڑ گیا۔ —— یہ بنگالہ کی بینا بولیں۔ وہ ہندوستان کا پہلا جگانے والا تھا۔

درشاہوار تاج سیاست نے کہا۔ معاف کیجئے گا، احقر کی رائے میں اگر پہلا سُلانے والا فرمائیں تو انسب اور زیادہ قرین حقیقت ہوگا —— بنگالہ والی بولیں۔ آج میں نے اس قسم کا خیال عمر میں پہلی مرتبہ سنا ہے۔ کیا آنجناب اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی پیش فرمائیں گے؟

درشاہوار بولے۔ بیگم اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوگی کہ آج تقریباً سو سال بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو تعلیم اور

ملازمتیں وہ ساتھ لاتے تھے ان کو ترک کرنے میں نجات ہے۔
اب کھدّی پہننے والا گفتگو میں دخیل ہوا اور بولا۔ محترمہ اس
مسئلہ میں میں بھی اپنے دوست سے اتفاق کرتا ہوں اور کہہ
دینا چاہتا ہوں کہ بیش از بیش راجہ رام موہن رائے کو ہندوؤں
کا جگانے والا کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا کسی حالت میں نہیں
اس لئے کہ یہ پاسبانان صحرا کا نام لیوا سوتا ہی نہیں جو جگایا جائے
اس کے اجداد بزم حال و قال میں جاگتے تھے۔ یہ محفل رنگ
و بو میں جاگتا ہے۔ وہ بھی شب زندہ دار تھے، یہ بھی شب زندہ
دار ہے۔ شاہ روم نے مسلمانوں کی فوج میں کچھ جاسوس بھیجے
تاکہ خبر لائیں کہ یہ کس قسم کے انسان ہیں۔ ان مخبروں نے جا کر
اطلاع دی کہ یہ رات کو فرشتہ بن جاتے ہیں، دن کو جن۔ اور
اگر ان کے خلیفہ کا لڑکا بھی چوری کرے تو یقین جانیئے کہ یہ اس کا
بھی ہاتھ کاٹ دیں۔ آج بھی مسلم وہی ہے اک ذرا سے رد و بدل
کے ساتھ ان کے بزرگ رات کو فرشتہ بن جاتے تھے، دن
کو جن۔ یہ رات کو جن بن جاتے ہیں دن کو ہیچ، اور جہاں تک
قطع ید کا تعلق ہے یہ خود فراموش، خویش دشمن اپنے ہاتھوں
اپنے ہاتھ کاٹ رہے ہیں ——— بہرکیف یہ سوتے نہ تھے

دہ جگاتے جاتے، انہیں صہبائے عیش ونشاط کا نشہ چڑھا تھا، جس کا اب تک خمار باقی ہے۔ انہیں جگانے کی ضرورت نہیں، ترشئ روزگار درکار ہے جو مقدر ہو چکی ہے۔ شاید ابھی کم ڈوز ملا ہے۔ نیز یہ تشبیہ بادہ ابھی صبوحی کی فکر میں مست ہے۔ مدعا میرا یہ ہے کہ مسلمان سوتا نہیں مشاغل بدلتا ہے۔ اس کی فطرت میں سکوت وجمود نہیں، فعل وعمل ہے، یہ اونٹوں کا حدی خواں سوتا نہیں راہ سے بے شک بھٹک جاتا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مسافر حیات کا سو جانا بہتر ہے، یا بے راہ روی، یہ مستقبل بتائے گا۔"

اب وہ بنگالن پھر بولیں۔ ارشاد ہوا "معاف کیجئے گا، مسلمان کو خمار دوشیں نہ تھا، بلکہ عیش وعشرت نے اس کے دل ودماغ مفلوج کر دیئے تھے۔ یہ عضو معطل ہندوستان کے گلے کا طوق بن کر رہ گیا تھا، سونے اور جاگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس پر نزلۂ موت اور خواب مرگ سوار تھا ان حالات کے تحت ہندوستان کو ارتقائی منازل پر لے جانے کے طلب گار کے واسطے نہ صرف اس عضو مردہ کو نظر انداز کرنا انسب تھا بلکہ قطع کرنا لازم۔"

تیز مغلوں کی انحطاط یافتہ حکومت ہندوستان کے سینے پر سوار تھی۔ سیاست وحیات ملکی متقاضی تھی کہ اس جسد بے جان کو ایک جانب پھینک دیا جائے، اور ملک میں دوبارہ تازہ روح پھونکی جائے۔ بندہ پرور ذرۂ صحرا سے جدا ہو کر صحرا نہیں کہلا سکتا۔ قطرہ دریا سے بچھڑ کر قطرہ کہلائیگا دریا نہیں ــــ ہندو مسلم اتحاد میں جو امر بیش از بیش رخنہ انداز رہا وہ مسلمانوں کا مجنونانہ ناز تھا کہ میں سید ہوں، میں مغل، میں پٹھان ہوں، میں شیخ۔ اور آج بھی یہ وہی جدی کی نے الاپ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ کرشن کا دیس ہے۔ یہاں مرلی کا راج ہے۔ یہ بے وقت کی راگنی نہ چلی ہے، نہ چل سکتی ہے۔"

اب کھری کہنے والا مسکرایا اور بولا! "اس سے قبل کہ میں اس موضوع پر مزید کچھ کہوں، یہ بات صاف کر دینی چاہتا ہوں کہ ہم سب ایک مطمح نظر رکھتے ہیں، اور وہ ہے ہندوستان کی بھلائی۔ میری رائے میں اگر ہندوؤں میں کوئی عیب ہے تو وہ صرف ہندوؤں کا نہیں، بلکہ تمام ہندوستانیوں کا عیب کہلائے گا۔ اور مسلمانوں کا نقص سارے دیس کو مطعون

کرائے گا۔ اس تخئیل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم جو اپنے پر یا
اپنوں پر نگہۂ تنقید ڈال رہے ہیں، وہ عیب جوئی کے لئے
نہیں، بلکہ چارہ سازی کے لئے ہے۔ یہ جستجوئے تشخیص
مرض منظر مداوا ہے، بغرض تشہیر نہیں۔ ہمارے نقائص اور
اسقام اگر سامنے آ جائیں تو ممکن ہے ہم ان سے آئندہ بچ
جائیں۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کا ایرانی، تورانی، و ترک
نازی ہونے کا فخر بے جا ہماری یگانگت میں خارج آیا لیکن
اس میں چھوت چھات بیش از بیش کارفرما نظر آتا ہے۔ اس
تنافر نے ہند و تجارت کو بلا شبہ فائدہ پہنچایا۔ لیکن قومیت
کی جڑیں کاٹ دیں۔ آج بھی اکثر و بیشتر وہ ہندو جو انگریزوں
کے ساتھ بلا تکلف کھا پی لیتے ہیں مسلمان کے چھوئے ہوئے
کو حرام اور نجس تصور کرتے ہیں۔ اسی کے پہلو بہ پہلو مسلمان کی
دریدہ دہنی اس شگاف کو بڑھاتی رہی۔ اور آج بھی یہ وجوہ
افتراق ہندوستان کے کوچہ و بازار میں رشتۂ یگانگت پر
مقراض زنی کر رہی ہیں ——— نیز جہاں تک مسلمان حکومت کے
نقش ہونے کا سوال ہے، خادم یہ عرض کر دینا چاہتا ہے
کہ جس زندہ حکومت کو راجہ رام موہن رائے بڑے لاڈ چاؤ

سے لاتے تھے ، ابھی آتے چند سال بھی نہ گذرے تھے ، بلکہ یوں سمجھیے کہ پوری طرح آئی بھی نہ تھی کہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک عرضداشت انگلینڈ جاتی ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے :-

"They cannot but feel that they have not profited by their connection with Great Britain to the extent which they had a right to look for."

اور آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"Though the revenue raised by the Company both from land and from other sources far exceeds what was drawn from the country by its Mohammadan rulers, a very inaddequate portion of it is devoted

to improvement in the means of land and water communications."

یہ الفاظ پوری طرح ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ جدید جہان اس زندہ و فرخندہ سے بہتر تھا —— مختصر یہ کہ "کبھی فرصت میں سن لینا — بڑی ہے داستان دل کی"

ایک رند مہ زال یوں اٹھا ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نگشود و نگشاید بحکمت ایں معما را

اہل بزم یہی چاہتے تھے۔ دوسرے کمرے سے سازندے طلب کیے گئے، اور بزم سرود آراستہ ہوئی۔ مطرب نے یہ غزل چھیڑی ؎

شباب اس پہ رعنائیاں توبہ توبہ ٭ نظر باز پیر و جواں توبہ توبہ
کچھ اختیار اپنے دل پر نہیں ہے ٭ محبت کی مجبوریاں توبہ توبہ
حرم میں جو پہنچے تو بت بن گئے ہم ٭ ہوئی چوک ہم سے کہاں توبہ توبہ
یہ تاثیر گرمیٔ اندیشہ کی تھی ٭ جو ہوتے آپ آتش بجاں توبہ توبہ

(۵)

گرمی آنے سے پہلے پہاڑ جانے کا انتظام ہو گیا مسوری
پر کوٹھی لی، دن عید رات شب برات تھی "ہیپی مین" اور
"استفلز" میں جشن رہتے۔ لیڈرز کار وبار سے فرصت
پاتے، آتے جاتے، دو چار دن ستا پھر چلے جاتے۔
خانہ بے تکلف تھا۔ نوکر چاکر کارواں ادا شناس۔
آج سرے (Seray) میں گسٹ نائٹ
(Guest night) ہے۔ یوپی کے ایک بہت
بڑے تعلقہ دار نے ہم کو مدعو کر رکھا ہے۔ پہلے ڈنر اور پھر
ڈانس۔ پچیس تیس کی پارٹی اول تو بج regmess
میں ڈرنکس شروع ہوئیں۔ اتنے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سرائی۔
کالی کالی گھٹا آئی اور چھا گئی۔ پہاڑ پر مینھ برسنے کیا دیر لگتی ہے
کہ چشم زدن میں بادل بن گئی۔ بادل برس گیا، بادہ نوشوں کی

بن آئی۔ دورِ ساغر تیز سے تیز تر ہوا۔ ایک نے کہا ؎

برسات کے آتے ہی تو زاہد نہ رہی توبہ
بدلی جو نظر آئی بدلی مری نیت بھی

دوسرا توبہ شکن بولا :-

بہ عزمِ توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

تیسرے بہانہ جو کے ہونٹوں پر یہ شعر آیا ؎

سخن درست بگویم نمی توانم دید
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم

بزم میں گل اندام بھی تھے کبک خرام بھی۔ سرو قامت بھی تھے، بیزار بھی۔ ایک بندۂ عشق ملکۂ حسن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ اٹھا ؎

بہ تختِ گل بہ نشانم بتے چو سلطانے
بسنبل و سمنش ساز طوق و یارہ کنم

جام ہونٹوں تک جاتے، نظریں معشوقوں تک۔ شیشے گردش میں تھا صہبائے عشق دور میں "مے شباب بھی تھی ساغرِ شراب کے ساتھ تو ـــــ مست چشموں کا گلاس بھی

عکس، جام میں میخانہ نظر آتا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ

شمع رخسار آتش بنتی تھی چشم گلابی کو
مے دو آتشہ ملتی تھی محفل میں شرابی کو

غرض کہ سب بے تکلف تھے، اور تکلف برطرف ــــــ خالی گلاس میز پر سے اٹھائے جا رہے تھے، ان کی جگہ دوسرے لائے جا رہے تھے۔ ایک دوربین ودوررس بولا "کاش بزم سیاست سے بھی مغزان سیاست اٹھ جائیں۔"

دوسرے نے جواب دیا" اس بساط پر مغز خالی ہو اور کیسہ پر تو بھی کام چل جاتا ہے۔"

میں بولی " ایسے یار شاطر نہیں یار خاطر کہلاتے ہیں۔"

پہلے والے صاحب نے فرمایا" لیکن آپ کو خیال نہیں، ان سے بہت زیادہ موذی تو وہ ہیں، جو ہوا کا رخ دیکھتے ہیں ــــــ یہ شہہ کچھ ایسوں پر پڑ رہی تھی، جو دونوں سمجھے رکھنے چاہتے تھے۔ گاہ گورنمنٹ سے مل جاتے، گاہ قوم پرستوں سے رسم و راہ بڑھاتے۔ تھالی کے بینگن تھے۔ بن پیندی کے بدھنے۔ جدھر نشیب پاتے لڑھک جاتے۔ نیز ایک گروہ ایسوں کا بھی تھا، جو حکومت کو بلیک میل کرتا رہتا تھا۔

کر رہے ہیں قوم پرستی نگاہ ہے زر و جاہ پر ــــ رخ میری
طرف نظر کہیں اور۔ دیس مندر میں آسن جمائے بیٹھے ہیں،
پر لو لگی ہے وائسرائے ہاؤس کی ــــ دعا اس در پر مانگ
رہے ہیں، شرفِ قبول کہیں اور سے درکار ہے۔

دس پانچ ہزار کے مجمع میں تقریر داغ رہے ہیں۔
غریب سامعین کو کچھ نہیں پہنچانا چاہتے، صرف حکومت کو یہ
خبر پہنچانی چاہتے ہیں کہ ان بزرگ کا نام سنکر دس ہزار متنفس
دور دور سے کھچا چلا آیا۔ تقریر نہایت کامیاب ہوئی ــــ
مدعا یہ کہ حکومت کوئی لقمہ تر پیش کرے، اور یہ منہ بند کر گھر
ہو بیٹھیں۔

اس سے یہ نہ سمجھیے گا کہ سب ایسے ہی تھے، ان میں وہ
بھی تھے جن کے پیروں کی خاک توتیائے چشم بنائی جائے
تو عین سعادت، جن کا سایہ پڑ جائے تو مس خام کندن بن جائے
ان میں وہ بھی تھے جو سب کچھ قربان کرنے آئے تھے، اور
ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے سب کچھ قربان کر کے دکھا دیا۔

لیکن رونا یہ ہے کہ چشم امتیاز و حقیقت بیں کی کمی کی وجہ سے یہاں
کھوٹا سدا کھرے کے مول بکا۔ اور کھرا اکثر و بیشتر پس منظر میں

پڑا رہا — یہ عذاب ہندوستان پر اس وقت تک نازل رہے گا
جب تک کہ صحیح قسم کی تعلیم عام نہ ہو جائے — Hermann

دور چل رہا تھا، باتیں ہو رہی تھیں، مہمان آ رہے تھے،
کہ ایک رکشا سیڑھیوں کے قریب ٹھہری، اس میں سے ایک
نہایت حسین سید اترا۔ کٹیلے نقش و نگار کسی فن کار سنگ تراش
کی صناعی کا مکمل نمونہ۔ رنگ میدہ و شہاب، ہونٹ شربتی
یونانی بت۔ آنکھیں داستانیں بیان کریں۔ تقریر اس کی لونڈی،
تحریر اس کی باندی۔ انگریزی انگریزوں سے بہتر بولے۔ درجہ
اول کا جرنلسٹ، پلیٹ فارم کی زینت، صحافت کی تزئین۔
محفل کی آرائش۔ ڈرائنگ روم کی زیبائش — یہ عاشق
معشوق طبع۔ محبوب تماشہ دوست، معشوق عشق پرور ایک
دختر کشمیر ساتھ لایا۔ —

Mrs Vijayalakshmi Pandit

برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

موتی کا سا رنگ، لعل کی سرخی ہونٹوں پر، ٹھوڑی میں تارہ،
ماتھے چاند، دسوں انگلیاں دس چراغ۔ بولے تو پھول
جھڑیں، ہنسے تو باغ کھلیں۔ گلابی ہونٹ، مستی بھری آنکھ۔

ناگن سی زلفیں زہر بھری، یہ آفت جان محشر خرام، قیامت
بدوش آتی - خموشی میں گفتگو کا انداز، گفتگو میں شہد کی گھلاوٹ
ساکت ہاتھ متحرک نظر آتیں - پیرہن چلے دل میں اترتے جاتیں
کچھ کچھ جوانی کا آغاز، جسم کا بچپن کی سیدھی لکیروں سے ہٹ
کر گولائیوں کی جانب میلان - کمر کے نیچے تیغ اصفہانی کا سا
خم - آئینہ زانو، سیم ساق - روپ کی رانی، سروپ کی دیوی -
نگارخانۂ کشمیر کا شاہکار، اور وہ بھی بوقت بہار -

میخانہ بس رہا تھا، حباب اٹھتے، شکل جام اختیار کرتے، زمین
پر لوٹتے، پیالے بکھرے نظر آتے، لیکن یہ بادہ و ساغر کا جہانِ
فانی جس کی بنا آب و باد پر تھی بننے نہ پاتا تھا کہ بگڑ جاتا تھا۔

محفل میں دور ساغر تھا، یہ ہمارے ہاتھوں گردش زدہ
تھا، ہم اس کے ہاتھوں چکر میں۔ انسان شراب کو ختم کر رہا تھا۔
شراب انسانیت کو۔

ڈنر کا تیسرا گونگ بجا اور ہم ڈائننگ روم کی جانب روانہ
ہوئے۔ ایک طرف بہت بڑی میز ہمارے لئے بچھائی گئی
تھی، ہر ایک سیٹ مختص تھی ——— دور بھی چل رہا تھا،
کھانا بھی۔ باتیں۔ ٹھٹھے۔ انسان کھانا اور شراب پر عمل کر رہا

تھا ـــــ میز پر ایک آرٹسٹ ٹیم صاحبہ تشریف فرما تھیں، ملبا ڈر سراچہ کا بانس، اس پر شرغا شرخ ساڑھی لپیٹی، کہنیوں تک چوڑیاں، کانوں میں ایک ایک بالشت کے بندے۔ رفتار مردانہ، گفتار منفانہ، ان کا نام تو کچھ اور تھا، لیکن ہر چوٹ پر کام آ جانے کی تعداد و صفت احباب ان کو آیوڈین کہتے تھے۔

میں اور حامد پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے، اور یہ محترمہ ہمارے مقابل۔ میں نے محسوس کیا کہ حامد اپنی ٹانگیں پیچھے کو سکیڑ رہا ہے، پھر ایک بار کھٹ سے آواز آئی، اور حامد کی آنکھ پھر جھپکی۔ میں اب تک ان تخت المیز یانوں کو سمجھی نہ تھی کہ ایک ٹھوکر میرے لگی۔ میرے ہاتھ سے کانٹا گر گیا، اور حامد قدرے مسکرایا۔ اب یہ چاند ماری شروع ہو گئی۔ اکثر یہ اندھے تیر خطا کریں اور میری ٹانگ نشانہ ہو ـــــ چند یہ لکد کوب برداشت کرنے کے بعد حامد نے آیوڈین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "برائے یاد دہانی یہ خادم گوش گزار کرنا چاہتا ہے کہ یہ سوپ کا ڈائننگ روم ہے۔ آئرلینڈ کا پلے گراؤنڈ نہیں۔ نیز اس ناچیز کی ٹانگیں فٹ بال نہیں ہیں۔

مانا کہ زندگی میں کِک اچھی ہے، وہ بے اعتدال کے ساتھ۔

ایک صاحب بولے "یہ فورورڈ ہیں" (Forward)

حامد نے جواب دیا "لیکن میرا یہ گول نہیں"۔ (Goal)

ایک تیتر کھانے کھانے بول اُٹھے "یہ فاوَل ہے۔

Fowl

ایک محبت کے مارے کے منہ سے نکلا "لیکن محبت

میں فیر" (Fair)

حامد نے جواب دیا "لیکن فینسی فیر نہیں" (Fancy Fair)

غرض کہ ٹیبل ٹوک بھی ہوتی رہی، ڈنر بھی، ساغر بھی چلتا رہا۔ چشم ساغر نما بھی۔ تقریباً دس بجے کے قریب ہم سب بال روم میں پہنچے۔

حسنِ مشرق مشاطۂ مغرب کی سحر کاریوں سے طلسم ہوش ربا بنا تھا ــــ گرم ملک والوں کے احتراق زدہ جذبات کو سرد ملک کے حیا سوز لوازمات نے بھڑکا رکھا تھا۔ میری مراد یہ ہے کہ کسی کو بیگن بیالو اور کسی کو بیگن تیج۔ مغرب کی سرد مہری جس درجہ قرب زن و مرد کی طلب گار ہے، مشرق کی گرم جوشی اسی قدر بُعد کی متقاضی۔ مزاج اپنا اپنا طریق اپنے اپنے۔"

ہندوستانی شباب کے سیمابی جذبات کو عریانیت،
بے حجابی، اتصال، منشیات کے آتش دان شعلۂ حیا سوز بنا
رہے تھے۔ ـــــــ بال روم کھچا کھچ بھرا تھا۔ بینڈ کی
مست آواز سے در و دیوار جھوم رہے تھے اور یہ الناس
علیٰ دینِ ملوکہم کی لے پر ناچنے والے مصروفِ رقص
صرف ادا محو ناز تھے، نیز ہر بات میں اپنے استاد انگریزوں
سے کچھ آگے، چونکہ نو دولتے تھے، اور سرمایۂ بے حیائی ابھی
ان کے ہاتھ آیا تھا ـــــــ کبھی والٹز بجتا کبھی فوکس ٹروٹ
کبھی بلیک بوٹم، کبھی رمبا، بتانِ شوخ و شنگ، کافر ادا،
ایمان دشمن، ناچتے اور نچاتے نظر آتے۔
باہیں ننگی، کھچی تنی ساڑھی، نشیب و فراز نمودار۔ قصہ
مختصر لباس برائے تسترِ جسم نہیں بلکہ برائے نظر گیریِ
عشاق تھا ـــــــ مرد کا ایک ہاتھ عورت کی کمر میں، عورت
کا اس کے شانوں پر، وہ سہارے ہوئے، وہ سہارا لئے۔
جسم ملحق ران سے۔ ران اشارہ لے۔ مرد آگے بڑھے۔
زن پیچھے ہٹے۔ مرد کا جھوک آگے کو، عورت تا کمر قبضہ میں۔
اوپر کا حصہ خم کھا جاتے، لیکن شانہ کا ہاتھ شریکِ رقص کو

اپنی جانب لاتے۔ کچھاوٹ لگاوٹ کے ساتھ۔ دوری دعوتِ اقدام لیے ہوئے —— اس کشاکش میں سینہ کا ابھار، جسم کے زاویے کمر کا خم، بدرجۂ اتم نمایاں، فردوسِ نظر بھی اور سلسبیل جذباتِ تشنہ بھی۔

عورت پچھلے پیروں جائے، مرد کے اشارے پر مڑ جائے، وہ بچاتا، کتراتا سنبھالے لیے جائے —— ہماری پارٹی کے سامنے ایک اور بڑے تعلقہ دار اپنے مہمانوں کے ساتھ مشغول ہیں، اس جھرمٹ میں ایک مست نازنین دلنواز خاص طور پر نظر فریب ہے۔ اس کا باپ ہندوستانی ہے اور ماں میم —— اس تخلیق جمیل میں اشتراک مشرق و مغرب اور اختلاط حاکم و محکوم ہے۔ یہ شجرِ آدم کا پیوندی پھل کر دس برید کی تمام و کمال خصوصیات کا حامل ہے —— صباحت و ملاحت کی آمیزش "تلون طبع پر استدلال کرتے ہوئے رنگینیٔ مزاج کی جانب کنایہ کر رہی ہے۔

اس مے دو آتشہ میں جذبۂ مشرق بھی ہے اور سیاستِ مغرب بھی —— رخسار میں غروبِ آفتاب کا رنگ، ماتھے پر طلوعِ مہر کی ضیا —— اس معجون بے ہوشی و خود فراموشی

میں امتزاج ہیجانِ مغرب اور سکونِ افیونِ مشرق ہے
مغربی بے باکی مشرقی حیا کے ساتھ۔ آنکھ میں شرمائی شرمائی
سی شوخی۔ باتوں میں حجاب کھیلے۔

اس مجسمۂ عشوہ فروشی کے پاس ایک نوجوان متمکن ہے۔
یہ جوڑا بہت گھلا ملا معلوم ہوتا ہے۔ کئی ڈانس ساتھ ناچ
چکے ہیں۔ اتنے میں لڑکا اپنی کرسی پر سے اٹھا، اور لڑکی
کے روبرو ایک گھٹنا ٹکا کر بیٹھا۔ آنکھوں میں محبت، لب
پر کچھ التجا تھی۔ لڑکی نے ایک تبسم کیا اور گردن جھکالی۔ اس
پارٹی میں ایک صاحب کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ مسٹر
جواد نے مس خان سے شادی کی درخواست کی، اور انہوں
نے شرف قبول عطا فرمایا ——— ایک جانب سے آواز
آئی "در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست" "اے زفرحت
بے خبر در ہر چہ باشی زود باش" ——— شادی بھی ابھی
ہو جائے تو بہتر۔ احباب نے اصرار کیا۔ دولہا دلہن نے
بھی انکار نہ فرمایا۔ دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔
غرضکہ بیچ بال روم میں یہ عروسِ نو اور نوشاہ کہنہ مشق
آن جمع ہوئے۔ دوستوں نے گھیر لیا۔ ایک نے انگشت

کہا۔ دوسرے نے "unto death" "تیرے
نے کھڑے ہو کر پھیرے کرائے"۔
دولہا مست، دولہن مخمور۔ قاضی کھڑا لڑکھڑاتے
فضا میں لغزش، ہوا میں مستی، دنیا چکر کھائے۔ ان حالات
میں یہ رشتۂ مناکحت استوار ہوا، اور یہ "کوک ٹیل میرج"
انجام پا گئی ـــــ شریکِ رقص شریکِ زندگی قرار پائی۔
گھر بال روم بن جائے گا، یہ سنگ ملکنی کا ناچ نچائے گا۔
دولہا دلہن کی ہاتھ پی گئی، شراب کا ساغر چل رہا تھا۔
آنکھ کا پانی ڈھل رہا تھا۔ حسنِ حجاب آلود اب بے باکانہ
ادا دکھا رہا تھا کہ بیلے ڈانسرز (Ballet Dancers)
آئے اور ایک زہرہ جبیں نے یہ گیت شروع کیا۔

انچلا سرکا جائے سجنیا، انچلا سرکا جائے
پتلی کمریا کھائے تو کیسے سنبھالا جائے

انچلا سرکا جائے سجنیا، انچلا
ریشمی بالوں پہ ریشم کی پیندری، کیسے نہ پھسلی جائے
انچلا سرکا جائے سجنیا، انچلا
مدماتی جوانی انت تیاری، سرکائے لیجائے
انچلا سرکا جائے سجنیا، انچلا

:(۶):

کل دیس کے ایک واس آن پہنچے، قلب دیکھو تو آرسی۔ آئینہ دار ملک و ملت، معاملہ کا کھرا دل کا صاف، تعصب سے کوسوں دور، شراب کا شائق، حسن پرست، ذات پات کا قائل نہیں، وسعت نگاہ کے ساتھ فراخیٔ قلب سے بہرہ مند اعتبار سے بالجبر حاصل کرنے والا۔ اپنوں کو زیادہ دینے پر آمادہ، کم لینے کو تیار، سیاست داں، وہ فعل و عمل میں شرافت سیاست پر غالب۔ لوبھ سے آشنا نہیں حرص و ہوس سے بے گانہ۔ فرد عزیز مردانگانہ، سچا لیڈر سارے ہندوستان کا بہی خواہ، ایک آنکھ ہندو، ایک آنکھ مسلمان، وسیع القلب، بسیط حوصلہ، نہ کوتاہ اندیش، نہ تنگ نظر۔

ان کے ساتھ ایک لیڈرانی بھی تشریف لائیں۔ بلبل بوستان تقریر۔ عندلیب گلبن شعر و سخن، طبیعت کنول کا پھول جس

پر ہیبت سے بھونرے منڈلاتے۔

بھاری بدن، سانولا رنگ، آنکھ میں جادو، لب پرسحر۔ ڈھلتی عمر، ابھرے جذبات —— یہ سر چڑھتے سورج سے آنکھ لڑاتی ہیں، قوم سے چنداں واسطہ نہیں۔ پبلک اوریشن (Orations) اور عوام سے داد چاہتی ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ان کی نگاہیں، گورنمنٹ ہاؤس پر کبھی نہیں پڑیں۔ —— ہر کہنہ مشق لیڈر سے ان کی چھوٹ ہوتی ہے —— اور سنا گیا ہے کہ نوجوانوں کو یہ یکہ تازِ چوگانِ جذبات نوازی تاج محل کی پرواز حسن و عشق فضا میں ہمہ گیر درس دیتی ہیں۔

ہم سب کوٹھی کے برآمدہ میں تھے کہ ایک نوجوان آ صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی ستھری طبیعت ہے، شائستہ مذاق۔ اردو انگریزی پر بدرجہ اتم حاوی۔ تقریر تحریر کا بادشاہ۔ زبان لونڈی، قلم باندی۔ نہ اس میں ہنر نہ اس میں کم —— بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، چھوٹا دہانہ، ستواں ناک، بیلن گردن، بوٹا سا قد، مجسم گلزار و گل اندام۔ قیامت کا جامہ زیب اجو پہن لے سج جائے، منہ سے بے ساختہ نکل جائے ؏

جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

باتوں میں مردانہ ادا، چال ڈھال میں لطافت، حسنِ خدا داد، اس پر ادائے خود اختیاری۔ خُلق اور حسنِ خُلق رگ و پے میں ساری وجاری، کھرا دوست کھڑل دشمن۔ اچھا لیڈر بننے کی تمام وکمال صفات سے متصف لیکن تلون کا پتلا، نیرنگی کا مرقع، تیزیٔ طبع پائے استقلال کے لئے متزلزل بلا۔ اس پر ایک رنگ کبھی نہ چڑھا۔ تغیر پسندی وتلون طلبی نے قدرے بدنام بھی کیا اور منزل سے بھی دور رکھا، ورنہ حق یہ ہے کہ یہ شخص صلاحیتوں میں کسی سے کم نہیں۔

آج کامٹی فول (Kamti Full) جانے کا پروگرام ہے۔ رکشوز (Rickshaws) آگئیں۔ ٹفن باسکٹس (Tiffin Baskets) تیار کرلئے گئے اور یہ قافلہ روانہ ہوا ــــــ لیڈیز رکشوز میں۔ مرد کچھ پاپیادہ کچھ گھوڑوں پر ــــــ چہل ہوتی گئی، چھیڑ چھاڑ چلتی رہی۔

شہر شہر نوقلیوں نے رکشوز کھینچیں۔ آگے چل کر محبت کا بوجھ تفننِ طبع کے طور پر کھینچا جانے لگا ــــــ معشوقانِ شوخ وشنگ ان رضاکار قلیوں کو ڈانٹتی جاتیں۔ یہ

گردن جھکانے چلاتے لئے جاتیں۔ محبت میں پیتے لگے
تھے، سڑک ڈھلواں، طبیعت زوروں پر، جبین عشق پر پسینہ
لب حسن پر تبسم، غرضکہ ہنستے بولتے عجیب لطف سے
راستہ کٹا۔ جب فول پر پہنچے تو پیاس بھی لگ رہی تھی اور
بھوک بھی۔

انسان کے اجداد پانی کے کنارے سایہ دار مقام پر
بیٹھ کر شکار کھایا کرتے تھے۔ یہ متمدن خلف بھی مقلد ہے
یہ ضرورتاً اور مصلحتاً لب جو سایۂ شجر تلاش کرتے تھے،
یہ تفریحاً۔

غرضکہ دسترخوان بچھا ـــــ ایک زبان دان بولے
لفظ اصل میں دستارخوان ہے۔ بگڑ کر دسترخوان رہ گیا۔
خاں صاحب نے مجھے ابتدا میں اوپن سٹ بھیجا تھا، وہ
بڑے گرویدہ تھے اور یہ Open Secret راز
پنہاں ہو گیا تھا ـــــ یہ سنکر کہ یہ لفظ دستارخوان تھا
بگڑ کر دسترخوان ہو گیا، بولے "صاحب بگاڑیئے نہیں، اب بنا لیجئے
دستار حاضر ہے!"

میں نے کہا "وہاں خوان میں 'داؤ' ہے اور آپ میں عطف

کی کمی" ـــــ فرمایا" اگر جناب کی نظرِ کرم منعطف ہو جائے تو بغیر عطف بھی اتصال ممکن ہے" ـــــ میں بولی" معاف کیجئے، معاف کیجئے! میں ایصال ثواب کی ایسی طالب نہیں جو فی سبیل اللہ مائل بہ اتصال ہوں۔ ابھی تو کچھ دن الفراق میں گردانیئے"۔

خاں صاحب بولے" آپ ہمیں کچھ گردانتی نہیں" ـــــ میں نے عرض کیا" بندہ نواز! جہاں تک قواعد کا تعلق ہے یہ لونڈی جناب کو ماضی مطلق گردانتی ہے، گذشتہ سے پیوستہ۔ تقویم پارینہ کہ نہ آید بکار ـــــ نیز جہاں تک کبوتر بازی میں گردان ہونے کا سوال ہے۔ ابھی کچھ دن چکر کاٹیے جب گردان ہوں گے" ـــــ بولے" اب تو ہم چکر لگے گئے"۔

میں" یہ قسمت کے چکر ہیں۔ تا قیامت قائم و دائم"۔

خاں صاحب ؎

چکر میں رکھنا تھا تو بنانا تھا جام سے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

میں" مٹی تو خراب نہیں، ہاں طینت خراب ہے۔ وَ خَلَقْتَہٗ مِن طِین اور جہاں تک جام سے بننے کا سوال ہے

اس کے لئے ظرف درکار"۔

بلبلِ بوستانِ تقریر بولیں "صاحب مردوں میں ظرف کہاں"۔

درِ شہوارِ تاجِ سیاست بولے "صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ مرد بڑے کم ظرف ہوتے ہیں"۔

بلبلِ بوستانِ تقریر بولیں "اگر آپ اسی شکل میں اس فقرہ کو پسند فرماتے ہیں، تو یوں ہی صحیح۔ باقی سچ یہ ہے کہ مرد جاتی تمام لطیف جذبات سے بے بہرہ، احساسِ حسن سے معرا، شعریت سے خالی ہے۔ بس یوں سمجھیے پتھر کی چلتی پھرتی مورتیاں ہیں جن کو شئے لطیف چھو نہیں گئی۔ خدا کی قسم خدا کی دنیا جنت ہوتی، اگر مرد نہ ہوتے، کرزہائے ناتراشیدہ لکڑی کے تختے۔ لکڑ کے لکڑ۔ میں تو انہیں دابۃ الارض میں سے تصور کرتی ہوں۔

درِ شہوارِ تاجِ سیاست نے ان کو ایک خاص نگاہ سے دیکھا اور کہا "اللہ رے تیری تیزی، زبان ہے یا مقراض۔ سچ ہے سہ

جدائی سے زیادہ عہدِ پیری جوش ہوتا ہے

بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

عہدِ شباب میں آپ نے کبھی مردوں کے خلاف زبان اس تیزی و طراری سے استعمال نہیں کی معلوم ہوتا ہے اب کچھ تلخ تجربے ہوئے۔

مفرّحہ: "معاف کیجئے گا، حضور نے مجھ سے زیادہ مہ و سال دیکھے ہیں۔"

درِ شہوار تاجِ سیاست: "مرد کا کیا ہے، ساٹھا اور پاٹھا۔"

مفرّحہ: "جی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد چوں پیر شود حرص جواں می گردد ــــــ چاہے ٹھڈا ہی ٹوٹ جائے چلے گا تن کے۔"

درِ شہوار تاجِ سیاست: "صاحب ٹھڈے کا کیا ہے جب تک مایحتا باقی ہے، پیچ لڑاتے جائیں گے۔"

مفرّحہ: "میاں کنّوں سے جاؤ گے، کانپتے آؤ گے۔"

درِ شہوار تاجِ سیاست۔ بیگم جو ذرا کھینچا ئی ہو تو کنکیا کے کنڈے نکل جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں چرخی کی خیر مناؤ۔ یہ سادہ لوحی اچھی نہیں، کہیں ڈور سے ڈانتے ڈور نہ ختم

ہو جائے، اور ہمارا کیا ہے۔ ذرا سا لنگر ڈالا اور گڈی کھینچ لی۔

نبض شناس ملک و ملت اجمل طبع جمال پرست بولے "کیا گڈی بازی کا سارا تلازمہ ختم کر دیجئے گا؟"

درِ شہوار تاج سیاست: "آپ کو تو معلوم ہے میں خاص دلی کا رہنے والا ہوں اور پھر برسوں گڈیاں اڑائی ہیں۔"

مقررہ: "جب ہی تو اڑ رہے ہو پر کھینچ کر دوں گی۔"

درِ شہوار تاج سیاست: "پر ہیں کہاں؟"

مقررہ: "جب ہی بے پر کی اڑا رہے ہو۔"

درِ شہوار تاج سیاست: "تم پرے وا — نہ کرو۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر خاں صاحب کی زبان کو زنگ لگا جا رہا تھا، انہیں ہر بہانہ مجھ سے بات کرنی — بولے "کیا پانی نہیں ملے گا، ہمیں پیاسا ہی رکھو گی۔"

میں نے کہا: "خدا نہ کرے، یہاں تو آپ کو غرق آب کرنے کا بھی سامان ہے۔" فرمایا "ہم کو تو ایک چلو کافی ہے" — میں نے جواب دیا: "بشرطیکہ آپ اس کے ہم وزن و ہم قافیہ ہوں۔"

جناب نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "ہم نے تو پہلے دن بھی ان سے پانی ہی مانگا تھا" ـــــ اور یہ سچ ہے. پہلی مرتبہ جب یہ صاحب میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے تو خیر سے پانی کا ایک جگ چڑھا گئے تھے. اب بھی وہ منظر میری نگاہوں میں ہے. تنوا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھ رہا تھا، اور گلاس پر گلاس بھر کر دیتے جاتا تھا، لیکن ہر گلاس کے ساتھ اس کی نظروں کا استعجاب اور دہانہ کی کشادگی بڑھتی جاتی تھی. جب جگ میں پانی ختم ہوگیا تو وہ بولا" اور لاؤں؟" حضور نے فرمایا " فی الحال کافی ہے" ـــــ غرضکہ ان کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ پہلی مرتبہ انہوں نے مجھ سے پانی ہی طلب فرمایا تھا. بہر نوع میں نے یہ فقرہ سنکر ان کو جواب دیا" ہاں دلہن بھی دولہا سے پہلے پہل پانی ہی مانگتی ہے"

خاں صاحب. کس لئے؟

میں " تاکہ وہ ہمیشہ اس کے سامنے پانی پانی رہے"

خاں صاحب. لیکن یہاں تو اثر الٹا ہوا ـ ہم آپ کے سامنے پانی بھرنے لگے.

میں: "معاف کیجئے گا، کچھ پانی مرتا معلوم ہوتا ہے اور سچ پوچھیے تو جناب پہ پانی پھر بھی گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں شہر کا پانی راس بھی آ گیا۔"

دریشہوار تاج سیاست: "یہ پانی کب تک ہوتا رہے گا؟"

میں: "ذرا پانی دکھا دوں ابھی ختم کرتی ہوں۔"

ابھی ذہن میں بہت سے فقرے بنتے کہ سامنے سے عنایت باقی سخاوت آباد والی آتی نظر آئیں۔ ان کو بلوایا گیا تھا۔ اکثر گانے کے شائق لب جو ترنم آبشار کے ساتھ سننا چاہتے تھے۔

آج ہمارے ہمراہ ایک نام کے آزاد بھی تھے۔ ان کا حسن بیان سے باہر، زور قلم کلک ہلال مانے۔ چرخ ارزق فام سیاہی پیش کرے۔ خورشید و قمر قرطاس ابیض۔ — سُرخ و سفید رنگ، نظر فریب نقش و نگار، چہرہ پر فرنچ کٹ ڈاڑھی، ذہانت ذکاوت لونڈی باندی، عربی فارسی کا عالم، تیزئ طبع سونے پر سہاگہ۔ حافظہ بلا کا پایا ہے۔ لاکھوں شعر ازبر۔ ہزاروں حدیثیں حفظ۔ بے مثل خطیب صفِ اول کا ادیب۔ کہا جاتا ہے کہ ستّے دو سالہ کا شائق

معشوق چاردہ سالہ سے کنارہ کش. علم و فضل رگ و پے میں ساری و جاری، اور کیوں نہ ہوتا اس شخص نے شبلی جیسے سمندرِ بے کراں سے ہر پہلو سے اکتسابِ علم کیا ہے، اور بہت تردد کے ساتھ، بچپن سے ان کا ہم صحبت رہا ہے — اس نام کے آزاد نے آبشار کی جانب دیکھا اور کہا دھار اوپر سے گرتی ہے، پھر اوپر کی طرف اچھلتی ہے. ہر شے جب بلندی سے پستی کی جانب ڈھکیلی جاتی ہے، تو پھر واپس جانا چاہتی ہے. ری ایکشن اتنا ہی قوی ہوتا ہے، جتنا ایکشن. لیکن پستی کا سکون اپنی جانب کھینچتا ہے — ہندوستان میں غدر بھی یہی تھا. وہ تریاک جمود و خمار عیش نے زیادہ اچھلنے نہ دیا۔

پانی ٹکراتا ہے تو جھاگ دیتا ہے. تصادم جوش پیدا کرتا ہے، لیکن وہ ہوتے ہیں جھاگ ہی ع

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خمار دوشیں ہمارے پیروں میں زنجیر بنا پڑا رہا. کچھ اس میں نفاق باہمی کو بھی دخل تھا. سر کوہ برف کے ٹکڑے نہ الگ ہیں، جن کو سورج یہاں تک پہنچاتی ہیں۔

اگر ہر ایک سوت اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے الگ راہ نکالے تو زمین میں جذب ہو جائے۔ یہ سب مل کر ایک راہ جاتی ہیں تو خس و خاشاک بہالے جاتی ہیں۔ قوم کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ کنبہ سر جوڑ کر کام کرے تو بگڑے کام بن جاتے ہیں۔ اب امریکہ کو دیکھ لو۔ تمام دنیا کی اقوام کی خلط کا نتیجہ امریکنز ہیں۔ تاہم ان میں یک جہتی ہے، یگانگت پائی جاتی ہے۔ امریکن جنگ آزادی میں سب دوش بدوش لڑے حقیقت یہ ہے کہ اختلاط و اتصالِ نسلِ آدم وجہ تخلیق اقوام مختلفہ ہے۔ ہندو مسلم شیخ سید، راجپوت شدر اور چھتری سب اپنی رگوں میں مخلوط خون رکھتے ہیں۔ شاید باید کوئی صحیح النسل سید ہے، یا ڈال کا ٹوٹا برہمن، سب آدم کی اولاد ہیں۔ اور گھُلی ملی نسلیں۔ ہاں جغرافیہ کے لحاظ سے اپنی اپنی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی مشرق کے رہنے والے، کوئی مغرب کے۔ کچھ ایک دیس کے رہنے والے، کچھ دوسرے کے۔

لیکن کیا کریں صحیح تعلیم کی کمی ہمارے عوام کو ان حقائق سے ناآشنا رکھتی ہے۔ اور جاہلانہ تبختر طبائع کو بے جا

امتیازات کی جانب مائل کرتا ہے. بہر نوع ناگزیر حقیقت یہ ہے کہ جب تک سورج ہے، برف کا ایک ایک ٹکڑا پگھلے گا کوئی آگے کوئی پیچھے. بچے گا ایک نہیں. سورج کے اجزا مائل بہ اتصال ہیں، اور برف کے راجع بہ انفصال، اول الذکر میں نفاق۔ اور نفاق وجہ شکست و ریخت"۔

کھانا ختم ہو چکا تھا، ساز مل گئے، گانا شروع ہوا۔

صہبا تو عجب کیف آور ہے، افسوس کہ ہم آشام نہیں
ساقی کا وہی پیمانہ ہے، اپنا تو مگر وہ جام نہیں
جو نقش دوام بٹھاتا ہے اور کام وطن کے آتا ہے
وہ جان سے اپنی جانے پر، ناشاد نہیں، ناکام نہیں
وہ عربدہ جو آیا ہے کہاں، آپس میں خلش بیکار سی ہے
کیوں بزم حریفاں برہم ہو، اس کا تو ابھی ہنگام نہیں
نورستہ کلی چٹکی ہے کہاں احساس حیا کیا شوخی کو؟
وہ دعوت نظارہ ہے مگر، آنکھوں میں ابھی پیغام نہیں
بیکار خفا تم ہوتے ہو، اور اپنے پر تم سے لیتے ہو
کیا جانے کس کو کہتے ہیں، ظالم تو تمہارا نام نہیں
محروم ازل خودداری میں کہہ کر کے یہی مر جاتا ہے

۹۲۱

مطلب جو کسی کا ہم سے نہیں، ہم کو بھی کسی سے کام نہیں
ہشیار بکارِ خویش ــــ دنیا میں فقط دیوانہ ہے
دیوانگی سے مقصود مگر وہ ذوقِ جنونِ عام نہیں

—— :(۷): ——

گھٹاؤں پر گھٹائیں آئیں۔ بارش ہوئی اور موسلا دھار ہوئی، ہم سب دن بھر کوٹھی کے گلیزڈ ورینڈا (شیشہ بند برآمدہ) میں بیٹھے سیر دیکھتے رہے —— بلبلے ٹوپیاں اچھال رہے تھے، ہر بوند سطحِ آب کو رقص میں لاتی، حباب آنکھوں کے سامنے سے قطار اندر قطار کاروانِ حیات کی طرح گذر رہے تھے۔

سائبان سے پانی کی چادر بہہ رہی تھی —— بارش آسمان سے گرتی، ہر اونچے مقام پر پناہ لیتی، لیکن نہ پاتی، آخر زمین پر آرہتی —— کوئی شے بلندی سے گر کر کہیں ٹک نہیں سکتی، جب تک انتہائی زوال کو نہ پہنچ جائے۔

پانی زمین سے آسمان پر چڑھتا، پھر زمین پر آرہتا ہے یہ دنیا عروج و زوال کا ایک چکر ہے اور تلک الایام نداولہا بین الناس کی تفسیر —— برآمدہ کے شیشوں سے بارش ٹکرا ٹکرا کر بہہ رہی تھی۔ حامد نے کہا" جو آئینہ طینت

منزہ درون ہیں، ان کے ظاہر تک اعیان دنیوی کی رسائی ہے"۔۔۔۔ ہمارے انفاس شیشوں کو اندر سے مکدر کر رہے تھے، میں نے ان کی جانب اشارہ کیا۔۔۔۔ وہ بولا "ہاں باطن آلودہ ہو سکتا ہے، لیکن اس وقت جب کہ اپنا نفس بھی ہم آہنگ مظاہرہ ہو جائے"

درشہوار ریاست نے حامد سے پوچھا "جناب نے ریاست "بھوجی" کے مشاعرہ کا کچھ حال نہ سنایا"

حامد۔ کیا عرض کروں، میں تو ایک دوست کی خاطر سے چلا گیا تھا، ورنہ میں تک بند تک نہیں، مجھے مشاعروں سے کیا واسطہ، ستدر سنگھ کا حکم تھا، میں انہیں بھائی سمجھتا ہوں سر تسلیم خم کیا اور ساتھ ہو لیا۔۔۔ آپ جانیں میں دیوانہ آدمی ریاستوں کے ماحول کی کب تاب لا سکتا ہوں۔ خاص کوفت ہوئی، لیکن صدمہ اس بات کا ہے کہ دوست پر بھی یہ بات کھل گئی، اور میں کمبخت باوجود کوشش اپنے جذبات چھپا نہ سکا"

میں نے کہا "آخر کیا بیتی، کچھ بتایئے تو سہی، کیا بیک بینی دو گوش نکالے گئے، یا نواب صاحب نے کچھ الٹی سیدھی سنا دیں؟"

حامد: "جی نہیں، نوبت اس حد تک تو نہیں پہنچی، یوں تو نواب صاحب اچھی طرح پیش آئے، لیکن ان میں اکثر بادشاہ کو لئے ابھی باقی ہیں، عزت عام میں نواب صاحب بہت اچھا اخلاق رکھتے ہیں، لیکن کریں کیا ہمارا کمبخت معیار ہی کچھ مختلف ہے۔ یوں کہنے کو ہنس مکھ انسان ہے، بات بھی اچھی طرح کرتا ہے لیکن اپنی کسوٹی پر رنگ چوکھا نہ دیا، کچھ پھیکا رہ گیا"

درشہوار سیاست: "اچھا اب تمہید ختم کیجئے، اور یہ فرمایئے کہ گزری کیا؟"

حامد: "صاحب اول تو نواب صاحب سے جب ہم سب کا تعارف ہوا تو ان کے ملنے کا انداز کچھ ایسا تھا، جیسے ہم سب تھئیٹریکل کمپنی کے ایکٹرز ہوں، اور ان کی ریاست میں اپنا کھیل دکھانے حاضر ہوئے ہوں، اور وہ ازراہِ التفاتِ خسروانہ ہم سے مل رہے ہوں، آپ کے خادم کا عمر میں یہ پہلا سابقہ تھا، ایڑی سے لگی تو چوٹی سے نکل گئی۔

کمرہ میں صرف ایک کشنڈ چیئر تھی، نواب صاحب اس پر متمکن ہو گئے، اور لگے ایک دو خاص اصحاب سے باتیں کرنے یہ آپ کا غلام مسہری پہ دراز ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ یا تو یہ شخص

صحیح اخلاق جانتا نہیں۔ ایسی حالت میں اس پر اخلاق ضائع کرنے بیکار ہیں۔ یا اخلاق برتنے نہیں چاہتا، تو ہم بھی بیسے کو تیا کریں، یا یہ تکلف انسان ہے، تو ہم کیوں تکلف اجس بیں ہے تکلیف سراسر، برنیں ـــــ غرضکہ ہماری تو اوندھی منطق ہے، دماغ نے یہی دلائل پیش کئے، اور ہم پیر پھیلا کر لیٹ گئے، اور لگے شوخ شوخ باتیں کرنے۔ ـــــ اب تنگی اطاق فراخ حوصلگی نواب پر کچھ گراں گذرنے لگی، اور انہوں نے دربار ہول کی طرف انتقال فرمایا۔ میں اپنے پلنگ پر لیٹا رہا، اور بھی چند احباب کو یہ کہہ کر روک لیا کہ یہاں باتیں کریں گے، وہاں کون بندھ کر بیٹھے، لیکن سندر سنگھ یہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ ان کا درم نا خریدہ غلام ان کی آنکھوں سے اوجھل رہے، پہلے بلانے کو آدمی بھیجا، پھر خود تشریف لائے، اور ہم گردن جھکائے دل میں کہتے ہوئے کہ

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ان کے پیچھے ہو لئے۔ کچھ صوفے کچھ کرسیاں ایک دائرہ کی

شکل میں بچھی تھیں، ہم سب ان پر ہو بیٹھے، اور دورِ شعر و سخن چلنے لگا ـــــ اتنے میں دو ملازم ایک نازک سی میز پکڑ کر لاتے، اس پر نہایت خوب صورت ٹی سٹ رکھا تھا، از صرف دو پیالیاں، یہ میز نواب صاحب کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہاں تک بھی خیر تھی۔ یہ حرکت نوکر کی غلطی پر محمول کی جا سکتی تھی۔ صاحب وہ لگے چائے بنا کر پینے، اور ہم سب بیٹھے منہ تکتے رہے۔ پھر آپ کا غلام بھی بس بالکل بے تکلف ہی ہو گیا ـــــ ہاں ایک بات نواب صاحب میں خاص تھی، اور وہ یہ کہ خدا معلوم کس مصلحت کے تحت یا کس علت کے باعث یہ حضرت جب بیٹھتے تھے کشنڈ چیر ہی پر بیٹھتے تھے۔ گدی سرک جانے سے کچھ اس درجہ خائف تھے کہ جب بھی ان کی تشریف رکھی جاتی۔ اس اندازہ میں نے یوں کیا کہ اسی دوران میں ہم سب ایک جگہ گئے، جہاں صرف ایک کشنڈ چیر تھی، اور باقی سب معمولی۔ نواب صاحب فوراً اس پر قبضہ مخالفانہ کر بیٹھے، اور ہم سب کے حصہ میں معمولی کرسیاں آئیں۔

یہ صحیح کہ وہ نواب تھے، لیکن یہ بھی صحیح تھا کہ ہم اہل

کے مہمان تھے اور مدعو شدہ - مزید برآں ہم میں سے کوئی ملازمت کا متلاشی نہ تھا، اور شاید وہ ریاست اتنی حیثیت بھی نہ رکھتی تھی کہ ہم میں سے کسی کو ملازم رکھ سکتی۔

اجمل طبع بولے " ہم نے سُنا ہے استاد بیداغ بھی شریک تھے "؟

حامد " جی ہاں "۔

اجمل طبع : یہ آخر کیوں ؟

حامد: وہ شاید اس ماحول کے عادی ہوں گے، نیز خطا معاف، خادم ان کو جوہر قابل سے معرا سمجھتا ہے یہ لوگ شعر کہہ کر شاعر نہیں بنتے، شاگرد بنا کر استاد بنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ استاد کہلاتے ہیں، شاعر نہیں ـــــ غالب شاعر تھا، گورنمنٹ ملازمت اس وجہ سے نہیں کی کہ اس میں عزت کم ہونے کا اندیشہ تھا۔

حافظ بر سر دربار کہہ آیا کہ " بہ بخششہائے ایں طور بدیں حال رسیدہ ام "۔ سعدی اتنکیا تو کے دربار میں بے تکلف پڑھ آیا سے

(۲) برف گدازاں یہ سر کوہ کز وہر لحظہ جزئے می شود کم

"تاجدارِ دنیوی کے سامنے بے ثباتیٔ دنیا کا بیان کرتے
ہوئے آخر میں کہتا ہے۔ تو نے ایسی نصیحتیں اپنے باپ سے
نہیں سنی ہوں گی تو اب اپنے چچا سے سُن۔
بندہ نواز! آپ نے بازار میں ایک ایک پیسہ کا
بجر بٹو بکتے دیکھا ہوگا، اس میں مٹی صحیح طریقہ سے بھری ہوتی
ہے، جھکتا ہے، تو جوہرِ قابل تو بڑی چیز ہے، اگر مٹی بھی
صحیح بھری ہو تو جھکنے نہیں دیتی۔ کجا شعریت اور قابلیت شعر
گوئی۔"

احمل طبع بولے: "اس ریاست کے تو اکثر خاندانی حالات
ناگفتہ بہ ہیں۔"

حامد: "جی مجھے معلوم ہیں، چونکہ ناگفتہ بہ ہیں، اس لئے
ناگفتہ ہی رہیں تو بہتر۔"

باتوں باتوں میں شام ہو گئی۔ کچھ بارش بھی ہلکی پڑی۔ ہم
سب ہیک مین (Hack man) میں جا براجے۔
مردِ سیاہ کپڑوں میں ایام الہیٔ شام بنے تھے۔ عورتیں
قوسِ قزح کی رنگینیوں میں نیرنگِ عالم دکھا رہی تھیں۔ بوتل
گلاس میں خونِ درون الٹ رہی تھی، اور یہ صدائے قلقل

ندا دے رہی تھی کہ

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

شمپین گلاسز (Champagne glasses)
ایک ٹانگ سے خدمت میں حاضر ——— کوک ٹیل
(Cock tails) مرغ طبع کو مائل بہ صفیر کر رہی تھیں۔
——— بینڈ بج رہا تھا۔ وائلن (violin) کا
سینہ تار تار تھا، پھر بھی دست آشنا کی ہر ضرب پر صدا دے
رہا تھا۔

طبل مصروف سینہ کوبی تھا ——— "کلارنٹ"
(Clarinets) موسیقار رہزنِ گلو کی مانند صرفِ
آشیاں سوزی اور ان سب سازوں کی ہم آہنگی مائل بہ
گناہ کر رہی تھی۔

مرد عورت اٹھتے مثل شب و روز گتھ جاتے۔ ہر وینس
(Venus) کے شانوں پر کیوپڈ (Cupid) سوار
تھا، اور اس کا تیر ہر اپولو (Apollo) صفت کے سینہ
کے پار تھا۔

تنبہاروں کے منہ کے بھاپ اور شراب کے

بخارات فضا میں اس درجہ تھے کہ بغیر پیے نشہ ہوا جا رہا تھا ـــــ حسن و عشق کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ خلقِ خدا کشتیِ حیات، دیو نشاط کے حوالہ کر چکی تھی ـــــ عورتوں کے سر مردوں کے سینوں پر ہم آغوشِ سکون ہو چکے تھے۔ مردوں کے منہ مشکیں زلفوں کے تاریک آشیانوں میں محوِ خواب۔

اس عالمِ رنگ و بو کے لئے بینڈ کی آواز نرم سیارگاں تھی، اور یہ اس کے سہارے چلے جا رہے تھے۔ وہ بند ہوتا تو یہ بیٹھ جاتے، وہ بجتا یہ رقص میں آتے ـــــ رنگِ حسن تھا جذبِ عشق۔ نشہ مے تھا سرود و مزامیر اور پھر اختلاطِ بے حجابانہ ان پانچوں نے مل کر حواسِ خمسہ پر چھاپا مارا تھا۔ ـــــ زمین و آسمان لڑکھڑا رہے تھے۔ وجہِ تخلیقِ عالم خود حضرتِ انسان لڑکھڑا رہے تھے ـــــ لغزیدہ پا حسین ٹھوکروں سے ذراتِ زمین محوِ ارتعاش تھے۔ اور انفاسِ مست نے فلکِ پیر کا سر چکرا دیا تھا۔

بارش تیز ہونے لگی۔ راکبِ فلک نے تازیانۂ آبدار برسائے۔ بینڈ زور سے بجا۔ دورِ شراب تیز تر ہو گیا۔ حسن

لے غازۂ معصیت سے رنگ لیا۔ آتشیں رخسار آب آتش دار سے اور بھی آگ بھبوکا ہو گئے، شمعِ عشق بھڑک اٹھی — اندھے دیوتا نے مستانہ وار تیر برسائے۔ اس پر بارشش کی چھما چھم اور مستزاد ہو گئی۔ اب شش جہت رقصاں تھے اور انسان مرکز۔ مرکز خود بھی ناچ رہا تھا اور نچا بھی رہا تھا۔

ایک معصیت خرام مستانہ وار اٹھیں۔ کمر میں کچھ عجیب حیاسوز خم۔ سینہ اور کولہوں کی جنبش پیر نود سالہ کے جذبات مردہ کو جھنجوڑ دے، دلوں کو برمائی، خواہشات کو بھڑکاتی، دعوتِ نظارہ پیش فرماتی آرکسٹرا (Orchestra) کی جانب چلیں۔ ان کو کچھ ہدایات دے واپس آگئیں۔ یہ مسز مخدوم ہیں۔ شوہر کی عمر پنجاہ سالہ ہے، اور یہ چھتیسی ابھی بیسویں منزل میں — ان بزرگ سے ڈرائنگ روم کی زینت لی ہے، بیوی نہیں، ڈرائنگ ٹیبل کی سجاوٹ نقل کی ہے۔ گھر والی نہیں۔ مخدوم صاحب ایک بڑی ملازمت پر مامور ہیں۔ انہیں احباب کی تواضع کے لئے جہاں ایک اچھی کوٹھی درکار تھی، وہاں ایک فراخ حوصلہ میز بانہ بھی۔

... الٹ سے الٹا دی، ہو بینہ یا بندہ۔

اب وہ نوابی ملازمت پر ہیں، اور محترمہ ان کے بالادست افسر مسٹر احمد کے ساتھ وارد مسوری۔ مسز مخدوم "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کے راز سے واقف ہیں۔ یہ ترقی پسند بیوی ایک تیر میں دو شکار کر رہی ہیں۔ ایک جانب تو شوہر کے لئے ترقی کی راہیں کھول رہی ہیں، دوسری جانب بغیر خرچ کے خوش گذران، اور اگر داؤں چل جائے تو اپنے لئے بھی اونچا ٹھکانا مد نظر ہے۔

ان سے دو میزوں پرے مسز گپتا تشریف فرما ہیں گو عمر میں ڈھل گئی ہیں۔ پر اللہ رے "میک اپ" اب بھی جوانوں سے اچھی نظر آتی ہیں، اور ان کے دیرینہ قدردان انہیں گھیرے بیٹھے ہیں ——— عمر منزل گہ حسن و عشق میں گذری ہے۔ ابھی تیرے چودہ سال کی تھیں، جو کونونٹ (Convent) کے میوزک ٹیچر (Music Teacher) پر دل آیا۔ یہ راگ رنگ لایا۔ کونونٹ میں بے وقت کی راگنی کھل جانے کے بعد نہ الاپی جا سکی، اور یہ دونوں خارج کر دیئے گئے۔ باپ بڑا آدمی تھا۔ سرٹیفکٹ پر اس کا ذکر نہ آیا۔ کچھ دن گھر پر ایک بوڑھے ماسٹر سے پڑھوایا

یہ اس کے گھر آنے جانے لگیں۔ اس غریب کے اکلوتے لڑکے پر ڈورے ڈالے۔ وہاں دیسی عشق شروع ہو گیا۔ استاد نے ان کے باپ کو سب کہہ سنایا، اور استعفیٰ دے اپنے گھر کی راہ لی، بیٹے کو گاؤں روانہ کر دیا۔

ہندوستان میں ایسی سمپورن پریم راگنی کی گنجائش نہ تھی۔ آخر باپ نے منگنی ٹیک کرا دیا، اور ان کی باقی تعلیم یورپ میں ہوئی۔ مسٹر گپتا ان کے باپ کے دفتر میں ملازم تھے، وہ نام نہاد سیاسی شوہر بننے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کو بھی تسطِ حال کی ضرورت تھی۔ اب یہ مسز گپتا ہیں اور سوری ان کی راجدھانی۔ دائیں ہاتھ پر مسز حمید تشریف فرما ہیں، ان کے شوہر والا بہت ہوا کرتے ہیں۔ یہ طرفہ سوغات وہیں سے لاتے تھے۔ اب نہ اگلتے بن پڑتی ہے نہ نگلتے۔ یہ خنگِ تیز خو اس راکبِ مضمحل سے دبتا نہیں۔ نیز "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" یہ بنگالی نژاد زاغ کو چھوڑ اپنوں میں جا ملی۔ اس وقت بھی مسٹر کوک کے ساتھ ہیں۔

بیچ کے بوکس میں مسز بانی اس با ذوق سماج سمیت تمکن ہیں۔
اس قلزمِ حسن کی آنکھ میں سمندر کی رنگت ہے، جبکہ شفق ان کے

گلگونہ رنگ بنا رہی ہو۔ اس پر سیاہ پلکیں آبنوسی چھپوں کی طرح چھا جاتی ہیں ـــــــ ناک "گلِ چمپک ولیکن ناشگفتہ" سیب زنخداں آدم کو دعوت دے ـــــــ یا تھا مہِ ہفت روزہ، اس پر بھویں جیسے برف پر کالوں کی ڈار ـــــــ ہونٹ جیسے گلگونہ رنگ کتاں شعاعِ ماہ سے مسک جاتے ـــــــ سر پر سیاہ بال ایسے ہیں جیسے مرمریں مجسمہ پر سنگِ موسیٰ کا چتر۔ یا رادھا کے ماتھے پر کنھیا کا ہاتھ۔ یا ڈسڈیمونا کے رخِ روشن پر اوتھلو کا سایہ۔ یا قلوپطرہ کے سینہ پر مارِ سیاہ ـ جیسے قلبِ صافی پر گناہ چھائے۔ یا تاج محل پر کالی گھٹا منڈلاتے ـــــــ عارضِ مصفا میں سرخی کی جھلک جیسے قلبِ صوفی میں خیال مے ارغوانی۔ یا شبنم کے قطرے میں سے گلاب کی پنکھڑی جھلکے ـــــــ سینۂ صافی پر کیوپڈ کے ڈیرہ، گنبدِ تاج محل کے تصغیری نمونہ ـــــــ سڈول باہیں یاسمن کے گجرے گلے میں پڑ جائیں تو ابنِ آدم ہار مانے ـــــــ شفاف انگلیوں کے آخر میں رنگے ہوئے ناخن جیسے بلوریں قلموں میں یاقوت یمانی آویزاں، یا برف کی شاخوں پر کشمیری گیلاس ـــــــ

شکم پر شکن۔ چاندی کی چادریں حسین سلوٹ جو اختلاط حسن و عشق کا پتہ دے ــــ اس آبِ حسن میں ناف زہرہ کی چاہِ زنخداں ــــ زانوؤں کی صفائی شہ خوارزم کی آبشار کو شرماتے ــــ یہ سبک رو و سبک سیر ناچنے میں پانی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ اپنے کو "پارٹنرز" کے کچھ اس طرح حوالہ کرتی ہے، جیسے جہاد میں آئی ہوئی لونڈی۔

جب یہ ہاتھ پھیلا کر "ڈانسنگ پارٹنر" کے آغوش میں آتی ہے، حسنِ مجسم بہ نیازِ عاشقانہ گلوگیر نظر آتا ہے۔ اور یہ گلو و عشقِ پیچاں کی مانند لپٹ جاتی ہے ــــ یہ شرمندہ کن سرو بیدِ مجنوں کی لچک رکھتی ہے۔

ناچ میں اس کے قدم خارج نہیں آتے، اور اقدام عاشق میں اس کی ادا مانع نہیں ہوتی ــــ عورت کا لوچ ہے مرد کی فراخ حوصلگی کے ساتھ ــــ پری کا حسن ہے عشوہ انسانی لئے ہوئے ــــ وقت عمرِ گذراں کی طرح گرے پانی سے گذرتا چلا گیا۔ اور ہم صبح پو پھٹتے "ہیک بن" سے مست و مخمور نکلے۔

حامد اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جاتے تھے

میری زبان پر بلا ارادہ یہ شعر تھا ؎

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانہ سے
جھک کے کچھ بات کہی شیشہ نے پیمانہ سے

---

(۸)

ہم سب آخر شب ہیک ہی سے اٹھے ——

حسن کی لغزش، عشق کی بے خودی بتا رہی تھی کہ —— یوں گردش میں جام بے خودی انجام پاتا ہے —— بجلی کی روشنی صبح کاذب کو صادق دکھا رہی تھی —— نشۂ شراب باطل کو حق بنا رہا تھا —— ایک شہر تھا کہ لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا —— اکثر بدمست رکشوں میں تھے —— عیش کے ماروں کو پیٹ کے مارے کھینچ رہے تھے ——

دولت لڑکھڑا رہی تھی، غربت ہانپ رہی تھی ——

آب آتش بار نے ملمع کاری اڑا دی تھی۔ بیسوہ کے چہرے اور صورت کی جھریاں نظر آ رہی تھیں —— فاسقانِ معیں راز کی باتیں نہایت راز دارانہ انداز میں بہ آواز بلند کہہ رہے تھے —— زبانِ گناہ اعلانِ حقائق کر رہی تھی۔ لیکن شعور آدم صمٌ بکمٌ عمیٌ کی تفسیر بنا تھا۔

میزوں پر خالی گلاس اجسامِ بے روح نظر آ رہے

تھے ——— کاؤنٹر پر ہمارے گناہ گنے جا رہے تھے
——— بو اتسز کراماً کاتبین بنے تھے اور منیجر داروغہ۔
کرسیاں خالی قبروں کی طرح منہ کھولے پڑی تھیں۔
ٹیبل کلاتھ پارچہ ہائے کفن نظر آرہے تھے ——— پیانوں
کے صف بہ صف پردہ سفید و سیاہ قبریں معلوم ہو رہے
تھے، یا شب و روز پہلو بہ پہلو مدفون ——— میوزک اسٹینڈ
پنجر دکھائی دیتے تھے ——— کشتی ہائے عیش یعنی۔ Ash
trays میں سگھٹ بنی تھی۔ کچھ راکھ تھی۔ کچھ نیم سوختہ سگرٹس
کے ٹوٹے رو سیاہ دیا سلائیاں کہہ رہی تھیں۔

دود آہِ سینۂ سوزانِ من
سوخت ایں افسردگان خام را

سفید پوش بو اتسز کفن چوروں کی طرح ٹیبل کلاتھ سمیٹتے
پھر رہے تھے ——— چند صبوحی کش باقیات الصالحات
ابھی موجود تھے، اور اس ماحول میں بھٹکی بچھڑی روحیں
نظر آتے تھے۔

کلوک روم بوئے ایک ایک ٹوپی سب کے حوالے
کر رہا تھا، جوڑے جوڑے نکل رہے تھے، کس کی کون سی تھی

اس کا کس کو ہوش تھا، اور کون کس کا ہوا ہے اس کی کس کو فکر تھی۔

میں بھی ایک رکشا میں حامد کے ساتھ ہو بیٹھی۔ شراب کا نشہ، ٹھنڈی ہوا، آخر شب آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور میرا سر غیر ارادی طور پر حامد کے سینہ پر جا لگا۔ عالم خواب میں دیکھا کہ سرفراز دانتوں میں انگلی دبائے سامنے کھڑا ہے میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ I am sorry

حامد نے کہا It is all right ---- میں نے کہا کس سے جواب کس نے دیا۔ اس کا کس کو ہوش تھا۔

میں کوٹھی پر پہنچا دی گئی۔ سرفراز کو عالم خواب میں دیکھا تھا، نیند نہیں آئی۔ حافظہ تصورات کے پردے پر گذشتہ فلم دکھانے لگا، کبھی بچپن یاد آیا۔ ماضی کی یاد نے ستایا۔ سرزنش سرفراز کے ساتھ جو زمانہ گذرا تھا، وہ سپنا بن کر آیا۔ شراب نے حافظہ پر سان رکھ دیا، احساسات کو تیز تر کر دیا۔ دماغ میں بجلیاں کوندیں، سینے سے بخار اٹھ رہے تھے، دل میں چمک سی ہوتی۔ آنکھیں بیخود پیاسی تھیں میرے جسم کا رواں رواں کچھ تمنائے نامعلوم رکھتا تھا۔

میں وہی رات کے کپڑے پہنے کھڑکی کھولے بیٹھی تھی کہ صبح کے آثار نمودار ہوئے ــــــ دھندلے نقوش روشن ہو چلے۔ سورج ابھی تاریکیاں چیر کر باہر نہ آسکا تھا۔ لیکن یہ منور کن عالم عالم کو اجاگر کر رہا تھا۔

شبنم کے قطرے آغوشِ گل سے بہائے گلبن پر آرہے تھے۔ عشرتِ یک شب کی قیمت فنا ہو کر ادا کی جا رہی تھی کہ سورج نکل آیا۔ جو بوندیں ابھی پتوں کی مخملیں سیج پر تھیں، دمک اٹھیں، لیکن ایک دم کے لئے۔

میں برآمدے میں آبیٹھی، حامد اپنے کمرے میں سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر تک ماحول کا سکوت ہم پر طاری رہا۔ لیکن انسان ماحول شکن ہے، اس کا پابند نہیں، پھر خموشی ٹوٹی اور باتیں ہونے لگیں۔

سامنے ایک درخت کے نیچے کچھ بھٹیاریاں لڑ رہی تھیں۔ حامد بولا " دنیا کہتی ہے کہ کتے ہڈی پر لڑتے ہیں زن، زر، زمین پر انسان۔ یہ کس پر لڑ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض طبائع غوغا پسند ہوتے ہیں۔ ان کے لئے شورش اور حیات مترادف ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ شورش پسند صرف

وہی طبائع ہوتی ہیں، جو طبع شور رکھتی ہوں۔ بنجر، ناکارہ، نااہل بے کار، بد فعل۔ آپ کام کرنے والے افراد اور کام کرنے والی اقوام کو کبھی مصروف فتنہ و فساد نہ پائیں گے۔ انگریزی میں مثل ہے Empty minds are the workshop of the devil.

اور شیطان کا مرغوب ترین شغلہ ابن آدم میں فساد کرانا دو بھائیوں کو لڑانا ہے۔

ہندوستان میں اکثر و بیشتر جھگڑے بلا وجہ ہوتے ہیں اس کا سبب محض بے کاری ہے۔ اگر ملک کو کسی دھن میں لگا دیا جائے۔ اگر قوم کو مصروف کار کر دیا جائے تو فساد و فتن بیش از بیش کم ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے بزنس سنٹرز مرکزہائے تجارت میں آپ سر راہ فتنہ و فساد نہ پائیں گے، چونکہ یہاں کے باشندوں کو اتنی فرصت نہیں ہے۔ مشہور ہے کہ جب پروہت جی خالی بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آؤ پڑوسن لڑیں۔ جواب ملتا ہے لڑے میری جوتی۔ مبارزطلب فرماتی ہیں۔ جوتی پڑتے دیر ہے ہوتوں سوتوں پر اور اچھی خاصی لڑائی شروع

ہو جاتی ہے بس اگر آپ ہندوستان سے فتنہ و فساد دور کرنا
چاہتے ہیں اور یگانگت کا بیج بونے کی تمنا رکھتے ہیں، تو وہ
طریقہ اختیار کیجئے جس سے ہر فرد کام سے لگ جائے، ورنہ
رات دن کی تو تو میں میں سے نجات ملنی معلوم۔

سامنے نہال تھی۔ مکھیاں پھولوں پر منڈلاتیں اور پھر
چھتے میں پہنچ جاتیں۔

میں بولی "شہد کس مشقت سے حاصل کیا جاتا ہے، اور
پھر انسان کس بے دردی سے توڑ لے جاتا ہے۔"

حامد نے کہا: "مگس کا حاصل کردہ ہر کس و ناکس لے نہیں
سکتا، ان میں خود خامی ہے۔"

میں نے پوچھا: "کیا؟"

حامد: "بیگم! ان کا ایک فرقہ نکھٹو ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ
دھرے بیٹھا رہتا ہے، اور ان کی ملکہ گوشہ نشین۔ یہی دو
کمیاں ہندوستان میں ہیں۔ ہم نے عورتوں کو عضو معطل کر کے
ڈال رکھا ہے، اور لیڈر نر کوئین بی کی طرح اپنے تخت کے
چبوترے پر بیٹھے دوسروں کی مشقت کا کھاتے ہیں۔ جس طرح
سال میں ایک مرتبہ "کوئین بی" نکلتی ہے، پرواز عروس کرتی

اور سب خانوں میں انڈے دے آتی ہے، اسی طرح
ان کا تخیل جمیل بھی برسوں میں ایک بار عالم بالا کی خبر لاتا ہے
اور پھر ہر دماغ میں انڈے دے جاتا ہے ــــــ ـــ ـــ
"گوئین پی" کی نسل کشی سے حیات پیدا ہوتی ہے، سامانِ
حفاظت نہیں، بعینہ ہمارے لیڈرز تحریکات پیدا کرنے میں
ذریعہ نجات و ترقی نہیں۔

میں :- "آپ کی رائے میں پھر کیا طریق کار اختیار کرنا
چاہیے؟"

حامد :- "گوئین پی کو عوام میں ملنا چاہیے۔ ان کی معاشرتی
کمزوریاں، سماجی کمیاں دور کرنی چاہئیں۔ ان پر قریب سے
نظر ڈالنی چاہیے۔ ان میں سے ایک بن جانا چاہیے، طائرانہ
نظر ڈالنے سے کام نہیں چلے گا ــــــ ہندوستان فی الحال
غریبوں کا دیس ہے۔ بد نصیب کسانوں کا وطن۔ کم زور مزدوروں
کا ملک۔ یہاں اسی طبقہ میں سے لیڈرز اٹھیں گے، اور ان
کے ہاتھوں نجات تا ناکی ممکن ہوگی۔ امیر لیڈرز ہندوستان
کو کام نہیں دے سکتے۔

ہم صبح سے شام تک گلا پھاڑ پھاڑ کر اسٹیج اور منبر پر

اعلان کرتے رہتے ہیں کہ انگریز نے ظلم ڈھا رکھا ہے، حالانکہ اگر بہ نظر غور دیکھتے تو اسّی فیصدی ظلم ہندوستانی ہندوستانی پر کر رہے ہیں۔

لیڈرز بھی جھوٹ نہیں بولتے، ان کو صرف انگریز کے ظلم سے واسطہ پڑتا ہے، اس لئے وہ اس ظلم سے آشنا نہیں جو اہل وطن ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتے ہیں، وہ اس زخم سے واقف نہیں جو برودرس سسٹرز کے لگا رہا ہے۔ وہ اس مسموم خنجر سے آشنا نہیں جو دست آشنا قلب آشنا میں گھسا رہا ہے۔

وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں، صاحب لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں، کلبوں میں جاتے ہیں، حاکم و محکوم کے امتیاز سے گھبرا جاتے ہیں ہوٹلوں میں انگریزوں کی دامن کشی سے جذبۂ خودداری مجروح ہوتا ہے، اقتصادیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ملک کا سرمایہ باہر جاتا نظر آتا ہے۔ فیکٹری کے واسطے زمین مانگتے ہیں تو وہ انگریز کو مل جاتی ہے، یہ محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں ہر روز تازہ

ہندوستانی دُبلے پتلے کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے
ان کو اس کا علم نہیں کہ چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں پر ٹکٹ بابو
غریب گنوار کو جانوروں سے بدتر سمجھ رہا ہے۔ ان کو اس کی
خبر نہیں کہ رانڈ ماں کو جب چاہنے والا بیٹا منی آرڈر بھیجتا ہے
تو لانے والے ڈاکیہ کے باپ دادا کا ورثہ اس میں شریک
ہوتا ہے، پھر جب وہی ماں ممتا کے پالے کو آسرے کا
پارسل بڑے مانوں ارمانوں سے بھیجتی ہے، تو میرا
ہندوستانی بھائی راستہ میں کھا جاتا ہے

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
طپیدن دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

لکھپتی لیڈرز، کروڑپتی مل اونرز کیا جانیں کہ سال
کے بارہ مہینہ شب و روز ہندوستانی پر ہندوستانی کیا
قیامت ڈھا رہا ہے ـــــ صحیح کہ ہم پر غیر حکومت
کر رہے ہیں، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ زندگی اتنی عذاب نہ رہے، اگر کم از کم ہم ایک دوسرے
پر ظلم کرنا چھوڑ دیں۔

لیڈرز جو اپنا وقت انگریز کے خلاف منافرت پیدا

کرنے میں صرف کر رہے ہیں، اگر اسی وقت کو ہندوستانیوں
میں اخوت پیدا کرنے میں خرچ کریں، تو سانپ بھی مر جائے
اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ——— نعل نفی کام نہیں دے گا۔
عمل اثباتی کارآمد ثابت ہوگا۔ انگریز سے نفرت تنکیری
پہلو ہے، اس سے حاصل کچھ نہیں۔

لیکن مودت پیدا کرنے والا عمل ایک طرف تو ایسا
ڈرامائی نہیں، دوسری طرف انسان جس سے زخم کھاتا ہے
اسی کے زخم لگانا چاہتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے تمام لیڈرز سرمایہ دار طبقہ کے ہیں۔
ان کو گورے ہاتھ چٹکیاں لیتے نظر آتے ہیں کالے ہاتھ
خنجر مارتے نہیں دکھائی دیتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان
کے احساس والا نشان تک گوروں ہی کی پہنچ ہے۔ کالوں کی
دسترس نہیں۔

کیا ضروری ہے کہ ہماری قومی تحریکات کی بنا بغض معاویہ
پر ہو، حبِ علیؓ پر نہ ہو۔ کیوں نہ ہم حب وطن کے پرچم تلے
جمع ہوں اور منافرت حاکم و محکوم کی علم برداری سے دستبردار
ہوں۔

ہندوستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کے سربرآوردہ رہبران ملک وملت نے کبھی صراطِ مستقیم اختیار نہ کی، سدا بھٹکتے رہے ـــــ مدتوں ہندوستان کی آزادی کا پرچم گنڈا انگلستان میں ہوتا رہا۔ الٹی گنگا بہ رہی تھی۔ جگایا جا رہا تھا ہندوستانیوں کو اور ڈھول پیٹے جا رہے تھے ولایت میں سمجھانا مقصود تھا ہندوستانیوں کو، اور زبان استعمال کی جا رہی تھی انگریزی۔ بچانا منظور تھا بھیڑ کو اور تلقین وارشاد کا مرکز تھا بھیڑیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے، کہاں تک بیان کروں، اور کب تک سناؤں "کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں دل کی"۔

سامنے سے ساحرہ آتی نظر آئی۔ میں نے اُسے بلا لیا۔ یہ ایک زنِ بازاری کی خوشرو لڑکی ہے۔ ابھی آٹھ سال کی تھی جو ایک صاحبِ دماغ لیڈر کی اس پر نظر پڑی خوشش خرام ہونے کے آثار پائے، اپنی تربیت وسیاست میں شائستہ کیا، نشست وبرخاست، ادب، آداب، بات چیت کے طریقے سکھائے۔ بازاری مال میں گھر کی نفاست آگئی، سراپا میں گھر کی جھلک نظر آنے لگی۔ جہل علم سے بدل گیا

ان گھڑ پر پوش ہو گیا۔ میراثی شوخی و طراری پر اکتسابی حیا کی ملمع کاری ہو گئی، سونے پر سہاگا، موتیوں میں دھاگا۔ رنڈی کی لڑکی لیڈر کی تربیت پانے کے بعد آفت کا پرکالہ بن کر نکلی۔ جاہل ماں نے اس کا نام منی رکھا تھا، لیکن ان بزرگ نے اسے ساحرہ کا خطاب دیا۔ اب یہ زہرہ رو نارود مشرب مسوری میں سحر کاریاں کر رہی ہے۔ تقریباً ۱۸ سال کی عمر ہے، شباب پھٹا پڑتا ہے۔ اساتذہ کا بہترین کلام یاد ہے، صحیح تلفظ سے گاتی ہے۔ پیانو، وائلن خوب بجاتی ہے۔ بال روم ڈانسنگ میں کسی سے کم نہیں۔ فی الحال بیلے ڈانسنگ سیکھ رہی ہے۔

(۹)

برسات شروع ہوگئی تھی۔ مسوری پر احباب کا آنا
کم ہوگیا، صبح سے شام تک مینھ برسے، بارش اجیرن ہوگئی
کہر کا یہ عالم کہ ناخواندہ مہمان کی طرح کمروں میں گھس آئے۔ وہی
ہیک میں، وہی سودے اور اسٹفل ہفتہ میں ایک آدھ
مرتبہ رنک میں اسکیٹنگ۔ انسان تلون پسند ہے۔ میرا
بھی دل گھبرانے لگا۔ ایک ہفتہ اس حالت میں گزر کر سارئی
کوٹھی میں یا میں تھی یا حامد۔ دن کاٹے نہ کٹتا۔ رات سر پر
آتی، ایسا ہی جی گھبرایا تو کسی بال روم میں جا بیٹھتے۔ اکثر
ہری چگ برسات سے گھبرا کر واپس چلے گئے تھے ستمبر
کی کھیپ آنے میں ابھی عرصہ باقی تھا۔ ایک ہی شکلیں دیکھتے
دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں، دل اکتا گیا۔

ایک روز میں نے اور حامد نے کامٹی فول جانے
کا پروگرام بنایا۔ اس سے پہلے بھیڑ کی بھیڑ گئی تھی جنگل
میں منگل ضرور ہوگیا تھا، لیکن جنگل کی سیر نہ ہوتی تھی۔ منتظمن

انسان کی کثرت ماحول پر چھا گئی تھی، اور قدرتی مناظر
میں آ گئے تھے۔

ہمارے جسم کامٹی فول پر تھے۔ لیکن دماغوں پر وہی
ڈرائنگ روم کی فضا طاری تھی۔ میرا تجربہ ہے کہ اگر نیچرل
سینری کا لطف لینا ہو تو یا تنہا جاؤ یا ہم رنگ وہم خیال
ایک دوست ساتھ لے جاؤ۔ اژدہام عام میں ان مقامات
کا حظ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ تم گھاس پات، پھول پتے دیکھ
لیتے ہو لیکن با حجاب تنہائی پسند عروس فطرت تم سے باتیں
نہیں کرتی، تمہیں اپنی آغوش میں نہیں لیتی۔

اسی تخیل کے تحت اور کچھ بال روم سے اکتا کر ایک
سہ پہر کو ہم پھر کامٹی فول جا پہنچے۔ سربفلک درخت نہائے
دھوئے کھڑے تھے۔ سبزۂ بیگانہ پر بھی رونق تھی۔ جگہ
جگہ خودرو پھول عجیب رنگ آمیزی پیدا کر رہے تھے۔
میں نے ایک توڑ لیا اور کہا "اس کا کوئی رکھوالا نہیں،
اس تک ہر کس وناکس کی دسترس ہے۔"

حامد نے ایک خاص نگاہ سے میری طرف دیکھا اور
خموش ہو گیا۔ پھر چند پھول بنفشہ کے مجھے توڑ کر دیئے

اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

"For get me not"

سامنے ایک سرخ رنگ کا پھول کھلا تھا۔ حامد نے اسے توڑا، ہاتھ میں کانٹا لگا۔

میں نے کہا: "زیادہ آگے نہ بڑھیے، قدرت نے کسی کو تحفظ خود اختیاری سے محروم نہیں رکھا۔"

پانی جوش مار رہا تھا۔ لہریں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔

حامد بولا: "پانی کنارے سے ہمکنار ہو رہا ہے، موجیں ایک دوسرے سے ہم آغوش۔ چھینٹے اڑ رہے ہیں، پریم ہولی ہو رہی ہے۔"

میں بولی: "ماحصل محض تردامنی۔"

سورج غروب ہو رہا تھا۔ حامد نے کہا: "عروس آفتاب حجلۂ مغرب میں داخل ہو رہی ہے۔ اتصال حقیقی نے کس درجہ سرخ رو کیا ہے۔"

آج خدا معلوم اسے کیا ہو گیا تھا۔ بار بار یہی موضوع چھیڑتا۔ خموش رہنا ہمت افزائی کرتا تھا۔ گو یا ماحول میرے دل و دماغ پر بھی اثر کر رہا تھا۔ تاہم پاسبان عقل نے جواب

دینے پر مجبور کیا۔ میں بولی۔

"تضیع انفرادیت اشکِ خون رلا رہی ہے۔ نیز جو وصال تاریکی سے ہم آغوش کرے اس سے فراق بہتر"

—— ایک پتہ درخت سے ٹوٹا، شاخ پر اٹکا۔ ایک جھونکے میں زمین پر آرہا۔

حامد بولا "مرکز سے جدا ہو کر چیز استقامت نہیں پاتی"

میں نے جواب دیا "مرکز ایک وقت بنتا اور ایک وقت بگڑتا ہے" ان الفاظ کے ساتھ ساتھ وہ پتہ اٹھایا، مختلف شاخوں پر لگایا، کہیں ٹک نہ سکا۔ پھر زمین پر ڈالتے ہوئے کہا "مرکز سے جدا ہونے کے بعد زمین آخری ٹھکانا ہے"

حامد سر جھکا کر خموش ہو گیا۔

میرا پاؤں بچھو بوٹی پر پڑ گیا۔ میں بلبلا اٹھی۔ برابر ہی پالک کا ساگ تھا۔ حامد نے فوراً توڑ مل دیا۔ سکون سا آگیا۔ آج اس کے ہاتھ میرے جسم میں بجلی کی رو دوڑا رہے تھے —— نہیں کہہ سکتی ذہنی اثر تھا یا حقیقت۔ لیکن اتنا میں نے ضرور محسوس کیا کہ اس نے ساگ ملتے ہوئے میرے پاؤں کو قدرے دبایا۔

خدا معلوم کیوں آج خوابیدہ جذبات کچھ انگڑائیاں
لیتے معلوم ہوتے تھے۔
حامد بولا "یہ دونوں بوٹیاں جزوِ تکمیلی ہیں۔
(Complimentry peices)
نظامِ عالم میں یہی حیثیت مرد اور عورت کی بھی ہے۔"
—— میں اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ دماغ نے جواب
پیش کر دیا تھا۔ لیکن اب خدا جانے کیوں دل کے آگے
دماغ کی چل نہیں رہی تھی۔ اور میں خموش ہوگئی۔
ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔ میرا مضمحل
اس کے دستِ توانا میں ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے باز کے
چنگل میں فاختہ۔ وہ گاہ گاہ گرفت سخت کرتا، گاہ نرم۔ مگر ہاتھ
بہرحال اس کی دسترس سے باہر نہ تھا —— سامنے
فاختہ کا جوڑا پھر رہا تھا۔ مادین نر کے آگے اٹھلا اٹھلا کر چل
رہی تھی۔ نر مستانہ وار اس کی ہر ہر ادا پر نظریں جماتے
چلا آ رہا تھا —— وہ گاہ فرشِ گیاہ پر آتی، گاہ شاخ
شجر پر۔ اس متوالے کو برگ و گیاہ سے کوئی مطلب نہ تھا۔
جہاں وہ جاتی یہ بھی پہنچ جاتا۔

ایک باز نے جھپٹا مارا، نر کوے گیا۔ مادین پر بجلی سی گری
وہ ششدر رہ گئی۔ ابھی وہ اس بپتا کو پوری طرح سمجھی نہ تھی
خالی آغوش دیکھنے اور منوحش ہوتی۔ نظریں بار بار اس
جگہ پر تھیں، جہاں اس کا ساتھی چند لمحے پہلے موجود تھا۔
اب اس کی نشانی دو بوند لہو پڑا تھا۔

میرے سینے پر ایک دھکا سا لگا۔ نگاہیں اس جیتے
جیتے خون پر جم کر رہ گئیں۔ سر چکرایا۔ وہ دو بوند لہو وسعت
پا کر سرفراز کا سر بن گیا جسم کا رواں رواں کچھ پکارا، اور اس
شورِ قیامت میں میں بے ہوش ہو گئی۔

جب ہوش آیا تو میں حامد کے کوٹ پر پڑی تھی، اور
وہ مجھے کچھ سنگھا رہا تھا۔ اس کے برابر ایک سادھو کھڑا مجھے
منوحش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

میں اب ہوش میں تھی، و لے ہاتھ پاؤں میں سکت
نہ تھا۔ حامد اور جوگی مجھے سہارا دے کر اوپر لائے، جوگی
مجھ سے آنکھ نہیں ملاتا تھا۔ نیز میرے ادراکِ نسوانی نے
کچھ ایسا محسوس کیا، جیسے وہ نامعلوم طریقے سے یہ کوشش
کر رہا ہو کہ اس کا چہرہ میری نگاہوں سے جہاں تک بچ سکے

بجا رہے ۔ بات کا جواب بھی وہ ہوں، ہاں ہی میں دیتا تھا، جب مجبور ہی ہو جاتا، تو دو چار لفظ بول دیتا ۔

اس کی آواز دماغ میں کچھ بھولے ہوئے ریکارڈ بجاتی معلوم ہوتی ، لیکن وہ اتنا کم بولا کہ اس آواز کو میں قائم مقام (Locomotion) نہ کر سکی ۔

جب حامد نے جوگی سے میرا تعارف کرایا تھا تو صرف اتنا بتایا تھا کہ یہ ادھر سے جا رہے تھے ، تم کو بے ہوش پا کر بطریق ہمدردی ٹھہر گئے ۔ ایک بوٹی اپنے پاس سے دی ، جسے سونگھ کر تم کو ہوش آگیا ۔

رکشا میں حامد نے اپنے حدود سے بڑھ جانے کی معافیاں چاہیں ۔ اور اس کے کہنے سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ عالم بے ہوشی میں میں بار بار اپنے مرے ہوئے شوہر کا نام پکار رہی تھی ۔

اس کا خیال تھا کہ جو عورت مرے ہوئے خاوند کی یاد کو اس طرح سینہ سے لگائے ہو ، اور خود فراموشی میں بھی اُسے نہ بھولے ، اس سے کسی مرد کا اظہار محبت کرنا گناہ عظیم ہے ۔

ہم گھر پہنچے تو ساحرہ بیٹھی راہ تک رہی تھی۔ آج کے جو واقعات میرے اور حامد کے درمیان رہے، منت کش گوش دیگراں نہ ہوتے۔

ساحرہ نے میرے چہرہ کے اضمحلال کی بابت دریافت کیا ــــ میں نے کہہ دیا سارا راستہ پا پیادہ طے کیا ہے اس کی تکان ہے۔

ہم سب نے کھانا ساتھ کھایا۔ پھر ساحرہ پیانو پر جا بیٹھی کچھ دیر پردہ چھیڑتی رہی۔ آج وہ بھی کچھ مسحور سی معلوم ہو رہی تھی، اور کسی خیال میں غرق۔ آہستہ آہستہ گنگنانے لگی۔ میرے کہنے پر آواز قدرے بلند کر دی ــــ آج اس کی آواز میں پردرد بھرا تھا۔ ہر سُر ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا تھا۔ سیدھا سیدھا گا رہی تھی، لیکن آواز سینہ کی گہرائیوں میں مثل تفنگ راست اتری جا رہی تھی۔

گانا نہ تھا، آہ تھی، تصنع سے خالی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوش الحان پرند کے تیر لگا ہو اور وہ قطرۂ کراہ رہا ہو۔ یا جیسے کوئی بانسری میں آہ پھونک دے، اور پھر وہ مختلف سروں کی راہ نکلنے کی کوشش کرے ــــ وہ

کوئی چیز مسلسل نہ گاتی تھی۔ کبھی کچھ شروع کرتی، کبھی کچھ، جیسے انتہائے غم میں الفاظ سلک تکلم میں منسلک نہیں ہوتے، اور فطرۃً زبان انسان سے نکلتے رہتے ہیں۔

بول دل سے نکل رہے اور دل پر پڑ رہے تھے —

— یہ بلبل تو کسی آشیاں سوختہ پرند کی مانند پیانو اسٹول پر بیٹھی مصروفِ بکا تھی۔

"چھپ تیری چھوٹی ہو بالما"

اور آواز بھاری معلوم ہوتی تھی

— کبھی قلب اپنی پوری بے تابیوں کے ساتھ پکارتا سُر بلند ہو جاتے، اور در و دیوار گونج اٹھتے۔ گاہ روح کا پنچھی سانس توڑتا معلوم ہوتا، اور ماحول مضطربہ کے ساتھ روتا — غرضکہ سُروں میں گاہ رقصِ بسمل کی تڑپ تھی، گاہ زخم خوردہ پرند کے دم توڑنے کا مضطرب سکون —

— گائی جاتی نسبتی اشعار لگائی جاتی۔

"چھپ تیری چھوٹی ہو بالما

دل سے اک آہ اٹھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

چھب تیری جھوٹی ہو بالما

زمانہ سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
انہیں اب دشمنی ہے ہم سے دنیا اس کو کہتے ہیں
چھب تیری جھوٹی ہو بالما

یہ شعر گاتے ہوئے آغوشِ چشم سے طفلِ اشک ڈھلک گیا۔ صنفِ نازک کو مبتلائے اندوہ دیکھنا حامد نے مناسب نہ سمجھا، عورت کی ان گہرائیوں کا راز دار عورت کو قرار دے خود اٹھ کر چلا گیا۔

اس محوِ غم کو نہ کسی کے آنے کی خبر تھی نہ جانے کی بیٹھی مسلسل گاتی رہی۔

"چھب تیری جھوٹی ہو بالما"

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں اٹھ اٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے
چھب تیری جھوٹی ہو بالما

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
چھب تیری جھوٹی ہو بالما

شریکِ بزمِ عشرت ہوں مگر خاطر مکدر ہے
دہانِ زخم ہوں ہنسنا مرا رونے سے بدتر ہے

چھب تیری جھوٹی ہو بالما
در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
چھب تیری جھوٹی ہو بالما

آخری شعر گا، پیانو سے اٹھ لگی جانے۔ میں نے ساڑھی کا پلو پکڑ لیا، اور کہا کہاں جاتی ہو بیٹھو اسٹفلز چلیں گے۔
وہ بولی وہیں سے آ رہی ہوں۔ مجھ پر کچھ عرصہ کے لئے یہ دروازے بند ہو گئے — میں نے کہا بات کیا ہے بتاؤ تو سہی؟
بولی "کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں دل کی"۔

(۱۰)

ایک روز قریب غروب ساحرہ آن پہنچی۔ یہ گل تورس
کچھ مرجھائی کمھلائی سی تھی، نہ آنکھوں میں پہلی سی شوخی، نہ باتوں
میں بے باکی۔ اس کشت زار زعفران پر پالا سا پڑا تھا۔
طبیعت کچھ گہنائی سی تھی۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ کھوئی ہوئی
سی ہے ——— چنچل تو یہ سدا کی تھی، لیکن آج کا اضطرار
کسی خاص بے قراری کا پتہ دیتا تھا۔

گھائل کی گت گھائل جانے، دل کی باتیں دل پہچانے
مجھے اس سے پہلی ملاقات کے بھی چند اشک آمیز جملے
یاد تھے، اس کا دل بہلانے ادھر ادھر کی باتیں کرنے
لگی ——— سرخ زرد سورج غروب ہوا چاہتا تھا، میرے منھ
سے بے ساختہ نکلا۔ عروس مشرق آغوش مغرب میں ہے
ساحرہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ چہرہ پر اس ڈاکٹر کا سا اکسپریشن
(Expression) تھا جو تیمار داروں سے کہے۔ اب
دوا دینے کی ضرورت نہیں، اور بولی "سورج تیرگی مغرب

دور کرنا چاہتا ہے خود تیرہ بخت ہو جائے گا۔
شمع محفل نور روشن کرنے میں ختم ہو جاتی ہے لیکن محفل
شمع کے ساتھ ختم نہیں ہوتی —— شبنم غنچہ کے لب
خشک تر کرنے آتی ہے، غنچہ مسکرا دیتا ہے، شبنم ختم ہو جاتی
ہے، دنیا میں نفسا نفسی ہے۔
زمین دانہ کو اپنے سینہ میں جگہ دیتی ہے، دانہ اسی
سینہ کو چیر کر سرکشی کرتا ہے۔"
میں بولی "ساحرہ زمین بھی بدلہ لے لیتی ہے۔ اس
دانہ کی ہر فرد ع کو خاک میں ملا دیتی ہے، دنیا اس دور
انتقام میں مبتلا ہے اور مبتلا رہے گی۔"
تھوڑی دیر ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے
ساحرہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا کہ گذشتہ ملاقات پر کہہ گئی
تھی کہ کبھی روئداد حیات سناؤں گی۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہی
آخر میرے اصرار پر بولی "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ
میں ایک طوائف کی لڑکی ہوں۔ ابھی نو سال کی تھی، جو ایک
جدت پسند نلون ناب لیڈر نے مجھے اپنی تربیت میں لے
لیا —— ماحول بدل گیا، فضا تبدیل ہو گئی۔ اُستادوں

کے گزکی زندے نکل ایک مہذب لیڈر کی سیاست میں
آئی۔ کوٹھے کی جگہ کوٹھی نے لی۔ میری دنیا بدل گئی۔ اری
اوچھتی کی جگہ اب مجھے مس ساحرہ کہہ کر پکارا جانے لگا۔ زندگی
میں ذرا ذرا سی بات انسان کا کریکٹر بنانے میں دخیل ہوتی ہے
روز مرہ کے واقعات سانچے ہیں جس پر ہم ڈھل رہے ہیں۔
—— اب مجھ میں خودداری پیدا ہونے لگی۔ ڈرائنگ
روم میں قدم مالکانہ اور حاکمانہ پڑنے لگے۔ الفاظ زبان سے
خوداعتمادی کے ساتھ نکلنے لگے۔ اری پر ایسی پھبتی جیسے
انگوٹھی میں نگینہ۔ ڈرائنگ روم میں سوفسٹیکیٹیڈ ed
se... میں ہی معلوم ہوتی۔ آنکھیں جھکا کر اور آنکھیں
ملا کر باتیں کرنے کی ادائیں مجھے آگئیں۔ چار بنانے کے ڈھنگ
میں نے سیکھ لئے۔ ڈرائنگ روم پوزز Poses پر
حاوی ہو گئی۔ کھانے کی میز پر نہ صرف مجھے کھانا آگیا۔ بلکہ
کھلانا بھی آگیا۔ ہر مہمان پر نظر رکھتی۔ بوئیر کو آنکھوں ہی آنکھوں
میں حکم نافذ کرتی۔ ٹوسٹ (Toast) میں پروپوز
(propose) کرنے لگی۔ باتیں مجھے بنانی آگئیں ——
—— استاد کو شاگرد پہ ناز تھا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتے

جیسے کوئی میکینک اپنی بنائی ہوئی مشین کی کارگذاری دیکھے
ــــ تقریباً چھ سال تک یہ کامل بت تراش مجھ ان گھڑ
پر صنعت کاری کرتا رہا۔ آخرکار یہ مجسمہ درخورِ قصر و ایوان
بن گیا۔

تکمیل کے بعد اٹھا، دوکاندار کے حوالے کر دیا۔
یعنی میں اپنے گھر بھیج دی گئی۔ سنگ تراش کو یہ نہ معلوم تھا
کہ اس کے تراشے ہوئے بت کو وہ ہاتھ یاد آئیں گے جنہوں
نے اس کے کڈھب زاویوں کو خوشنما گولائیوں میں بدلا ہے۔

اس زمانہ میں میری عجیب کیفیت تھی۔ ایک تو کچھ
اس دنیا بدلنے والے سے تعلق خاطر ہو گیا تھا۔ میں اس
جذبہ کو سمجھتی نہ تھی، لیکن دل کچھ ڈھونڈتا تھا۔ دوسرے
ماحول کی تبدیلی نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔ میری کیفیت
اس ایکٹرس کی سی تھی جسے شہزادی زرینہ کے پارٹ کے
لئے تیار کیا گیا ہو، اور اچانک اسٹیج پر لانے کے بعد زریں
لباس اتار کر اسے لونڈی کے کپڑے پہنا دیئے جائیں،
اور مقابل شہزادہ گارد کی جگہ حبشی غلام لا کھڑا کیا جائے
وہ ظالم اپنا پارٹ جانتا ہو، اور برابر کلو حسان (لقمہ)

دے، اور یہ غریب نہ کچھ سمجھے نہ کچھ کر سکے۔
کمہار سیروں میں پڑی ہوئی مٹی کو اٹھاتا ہے۔ رنگ روپ دینا کھلونا بناتا ہے، دکاندار کو دے آتا ہے وہ بھی سجا کر رکھتا ہے۔ لاڈلی اولاد کے ماں باپ خرید لیتے اور بچے کے حوالے کر دیتے ہیں، حق بحق دار رسید یہی میرے ساتھ ہوا۔
ماں کے گھر آنے کے بعد مجھے ہر چیز نئی اور اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ ان لوگوں کا طریق گفتار، کھانا، پہننا، رہنا سہنا، انداز تخاطب، آنے جانے والوں کی چال ڈھال، ان کے آزادانہ مذاق، کھلی کھلی باتیں، اٹھکھیلیاں عشق کی گھاتیں، نہیں کہہ سکتی کہ میرے دل و دماغ پر کیسے کیسے ہتوڑے بجاتی تھیں۔
ایک روز کوئی نواب صاحب چند مصاحبوں کے ساتھ تشریف لائے۔ ہم کو پہلے سے اطلاع کرا دی گئی تھی۔ میں بھی بنی سنوری تیار بیٹھی تھی۔ سر پہ پگڑی نہیں پگڑ، بلکہ اس کا بھی قبلہ گاہ۔ مونچھیں نیش عقرب۔ باچھوں میں سے پان بہہ رہا، گراں ڈیل، پیل پیکر، بے ہنگم بد ڈول۔ اچکن

پان کی افشاں۔ پیروں میں انگریزی جوتا، لیکن بند بندش سے
نا آشنا، سفید چاندنی پر دراتے چلے آئے۔ میں اماں کا
اشارہ پا تعظیماً کھڑی ہو گئی، یہ میری جانب پیٹھ کر ہو بیٹھے
اور لگے والدہ سے باتیں کرنے۔ بار بار مڑ کر مصاحبین کی
جانب دیکھتے، وہ نظر پڑتے ہی بغیر یہ سمجھے کہ حضور کیا
فرما رہے ہیں، مشین کی طرح بجا درست کہہ دیتے۔

جیسے سبحان من یرانی پر
لڑکے مکتب کے کہتے ہیں آمین

میں اس فضا سے قطعاً نا آشنا، دل ہی دل میں گھٹ
رہی تھی کہ اماں نے اس گوشت کی چٹان کی ایک جانب سے
منھ نکال کر مجھ سے کہا "ادھر آ بیٹھو"، میں قہرِ درویش
بر جانِ درویش حسب الارشاد اس کندۂ ناتراشیدہ کے
روبرو ہو بیٹھی۔ جناب نے کوئی ایک منٹ مجھ پر اس طرح
نظر ڈالی جیسے قصائی تیار بھیڑ کو دیکھے، اور ایک طویل
ہنکارا ابھرا۔

گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ: دس پانچ پان کھا، کچھ والدہ کو
دے یہ تو ٹلے۔ لیکن پیغام سلام چلتے رہے۔ میں نے ایک

دفعہ ہونا کی تو پھر کسی عنوان ہاں کر کے ہی نہ دی۔ سنا ہے اس کے باوجود اماں اور ماموں انہیں موستے رہے۔

ایک دق کے مارے پھیپھڑا گلے تشریف لائے۔ ان کی بابت سنا گیا تھا کہ تنخصی اتارنے کے سخت شوقین ہیں۔ اس شکار مرگ کو اتنا خیال نہ تھا کہ جناب ملک الموت انہیں بہت جلد سرفراز فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان کی ادا ہی نرالی تھی اپنی نقاہت کو نزاکت تصور کرتے تھے۔ آنکھیں نیچی کر کے بات کرتے، اور بات بات پر سلام، چند تولہ کی بید ہاتھ میں تھی، سو وہ بھی ملازم کے حوالے یہ کہہ کر کر دی کہ اسے اٹھائے اٹھائے ہمارے ہاتھ تھک گئے۔ عطر میں دلہنوں سے زیادہ بسے ہوئے سفید براق چکن کی اچکن، اس میں جواہر نگار بٹن۔

ایک سکھ ٹھیکیدار تشریف لائے جیسے بارود کا پورا منہ پر دست حجام سے نا آشنا جھاڑیاں۔ سر پر گنبد افراسیاب، جس میں سے تار عنکبوت باہر نکلے پڑتے تھے۔ والدہ نے پان بنایا، میں نے تھالی میں پیش کیا بولے "اسے منہ نوں پاؤں جو گا، کڑی تو لے جا۔

بڑی سوہنڑی، ساڈے کول آجا"

غرضکہ اس قماش کے آتے رہے، میں انکار کرتی رہی۔ اماں بگڑتی رہیں، لیکن یہ خیریت تھی کہ میری مُنہ دکھائی ہی میں وہ اچھا خاصا مار لیتی تھیں، اس کے علاوہ گاہک ہر پھر کر آتے رہتے، اور ہر پھیرے کچھ نہ کچھ دے کر جاتے۔

ستم بالائے ستم یہ اور ہوتا کہ عباس صاحب کے ہاں آنے والے گاہ گاہ ادھر بھی نکل آتے، اس وقت مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا۔

ان حالات میں الہ آباد سے کچھ لوگ آئے۔ اماں سے باتیں کرتے رہے، آخر میں عقدہ یہ کھلا کہ کسی تھرڈ رئیس زادہ کی طبیعت اپنے شہر کی کسی اچھے گھر کی لڑکی پر لوٹ گئی ہے، وہاں رسائی ممکن نہیں، لڑکا دیوانہ ہے، ماں باپ پریشان، آنکھوں کا تارا، گھر کا چراغ، اکلوتا بیٹا، حکیم سیانے سب کر چکے، ذرہ برابر افاقہ نہیں۔ اب شفاءالملک بہادر نے یہ تجویز کیا ہے کہ کسی نہایت حسین لڑکی کو اس پر راضی کیا جائے کہ ان کا دل بہلائے، اخلاص بڑھائے تاکہ دھیان بٹے، دل ہٹے۔ بیاہیوں نے باتوں باتوں میں

بڑھی کان میں ڈال دیا کہ لڑکا بالکل الھڑ ہے، جو لڑکی نے ذرا دل
دہی کی دلداری سے کام لیا تو کام بنا سمجھو۔ ہم شہر شہر پھرتے
ہیں، تمہارا نام بھی کان میں پڑا چلے آئے، جو مان جاؤ تو اچھا
ہے، اتنا ہم کہے دیتے ہیں کہ جو لڑکے کو جچ گئی اور نکاح
کر لیا، یا فقط ڈال بھی لے، تو عیاں تو ساری عمر کے دلدر کٹ
گئے۔

کچھ تو اڑتی اڑتی کان میں پڑ ہی چکی تھی، پھر اماں نے بھی
مجھ سے ذکر کیا۔ سب معاملہ تو نہیں بتایا۔ ہاں جستہ جستہ
کہہ سنایا، یہ نیا تجربہ میرے بھی دل کو بھایا، ساتھ کے
ساتھ یہ بھی خیال آیا کہ اگر میزان پٹ گئی، اور مجھے گوشہ عافیت
مل گیا تو اچھا ہے، لیکن میں اپنے گاہکوں میں ایسے بدذوق
کڑ کھاتے اور فربہ اندام توندل بے ڈول دیکھ چکی تھی کہ
کسی طرح دل نہ ٹکا، اور اس پر اصرار کیا کہ مجھے پہلے ایک
نظر دکھا دو، پھر حامی بھروں گی — یہ ناممکن تھا —
سودے کو حق نہیں کہ گاہک کو دیکھے، جو دام دے گا
سودے گا۔ ہاں گاہک مال کی جانچ پڑتال کرے تو حق بجانب
اور اب میری حیثیت بازاری مال سے زیادہ نہ تھی۔

خدا خوش رکھے عباس صاحب کو جنہوں نے میری آنکھیں کھول دی تھیں، کاش یہ بصیرت نہ حاصل ہوتی۔ امتیازِ مدارجِ حیات نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ یہ چند روزہ خوش آئند خواب نہ دیکھتی ۔۔۔ یہ خواب خوابِ مرگ ہوتا تو خوشتر ہوتا ـــــــ لیکن شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن۔

بہر نوع میں نے کم از کم تصویر دیکھے بغیر گھر سے جانے سے یک قلم انکار کر دیا۔ یہ شرط پوری ہوئی۔ کوئی ستّرہ سالہ لڑکا، سبزہ آغاز، تصویر منہ سے بولے، آنکھیں دل میں اتری جاتیں، ستواں ناک کٹیلی بھویں، ٹھوڑی جیسے سفیدے کی کیری۔ غرضکہ تصویر بولی نہیں پر مجھے جانے پر راضی کر دیا اور سامانِ سفر تیار ہونے لگا، پھر بھی دل میں یہ ڈر لگا تھا کہ کہیں ظالموں نے چلتر نہ کیا ہو۔ مرقع کسی اور کا ہو۔ اگر وہ تصویر والے نہ نکلے تو کیا ہوگا ـــــــ

غرضکہ ایک حالت بیم و رجا میں الہ آباد پہنچی۔ باغ میں اتاری گئی، ہر قسم کا آرام، نوکر چاکر خدمت کو حاضر، حکم کی دیر، حکم پورا ہونے کی دیر نہیں۔ اعلیٰ درجہ کی کوٹھی، بہترین فرنیچر، چھوٹا سا ایک کتب خانہ بھی۔ باغ یا باغِ ارم۔ انگریزی مذاق

اور ہندوستانی ذوق لیے ہوئے۔ ہر طرف سنگ مرمر کے بت۔ دُرپاش فوارہ۔ لیکن لطف یہ کہ سبز پری منتظر اور گلفام غائب ــــ آتش شوق بڑھتی گئی، دل کی کسک ابھرتی گئی، نہ کتابوں میں دل لگے نہ سیر باغ میں۔ نہ کھانا اچھا لگے نہ پینا۔ بے شرمی کی بات کسی سے پوچھ بھی نہ سکوں کہ نواب صاحب کب تشریف لائیں گے۔ جوں جوں دن گذریں وسواس پیدا ہوں، دل نگوڑا ڈوبا جائے ملازمین باتمیز آواز پر حاضر، کام کریں چلے جائیں۔ بات چیت کی گنجائش نہیں، عجب خلجان، عجیب گومگو کا عالم، ایک آدھ مرتبہ وہ صاحب بھی آئے جو گھر سے لائے تھے پوچھا کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ــــ اللہ رے میزبانی۔ جسمانی آسائش سب مہیا۔ مزید استفسار بھی۔ روح پھڑکے رگ جاں میں کانٹا کھٹکے۔ اُسے کوئی نہ پوچھے۔ جی میں تو آئی کہہ دوں کہ ؎

نشتر چہ زنی رگِ جنوں را

آگاہ نئی تپِ دروں را

چاندنی راتیں آئیں، چاند اپنے شباب پر تھا ہیں اپنے

شباب پر۔ باغ کی ہوا، پر کیف فضا، سامان عیش، عیش باغ کی رانیں۔ غنچہ پر غنچہ منہ رکھے دے، ڈال پر ڈال جھکی پڑے، برگ و بار گلے ملیں، شجر جھومیں، گل ایک دوسرے کا منہ چومیں —— فوارے چل رہے تھے، بوند کے پیچھے بوند گہرائیوں میں جا رہی تھی۔ قطرہ دریا کی تلاش میں تھا۔ فوارہ کا پانی بصد راہ حوض میں مل رہا تھا۔ میرا سن

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

گھٹی ہوئی جوانی، ابھرتے ہوئے جذبات۔ کوئی گیارہ کا عمل ہوگا، چاندنی چٹکی ہوئی، میں اکیلی صوفے پر بیٹھی تھی کہ اچانک قد آدم آئینہ پر نظر پڑی۔ میں حسن و شباب کے ساتھ خوش مذاقی کا مرقع بنی تھی۔ سفید ساٹن کا ڈھیلا سا پاجامہ اس پر سفید گلشن کا کچا تنا کرتا، انگیا غائب، لوٹ جالی کا دوپٹہ کچھ کھلا کچھ ڈھکا۔ اس مجسمہ نے مجھے مست کر دیا۔ فضا نے ہوا دی۔ دل نے کچھ مانگا۔ بھرپور شباب نے کچھ کمی محسوس کی، میں اٹھلاتی ہوئی باغ میں آئی۔ ایک فوارہ کے کنارے جو کیوپڈ کی شکل کا بنا تھا، ہو بیٹھی۔ جذبات نے

لحن اختیار کیا، اور میں گانے لگی۔

"ایسے میں اگر آپ بھی آجائیں تو کیا ہو"

چشم نرگس میں نورِ شبنم ہے ... شاہدِ گل کا انتظار ہے آج

ایسے میں اگر آپ بھی آجائیں تو کیا ہو

ابر است و بہار است و ہوا ہم مزا دارد ... برخیز کہ لغزیدنِ پا ہم مزا دارد

ایسے میں اگر آپ بھی آجائیں تو کیا ہو

انگڑائی سے رہا ہے کسی کا شباب آج ... خوابیدہ خواہشوں کو جگانا ضرور ہے

ایسے میں اگر آپ بھی آجائیں تو کیا ہو

جذبات نے دیوانہ کر رکھا تھا، موسیقی نے مست بنا دیا۔ میں بیخود انداز میں بیٹھی گا رہی تھی کہ بوٹوں کی کچھ کھڑ کھڑ سنائی دی۔ میں سمجھی کوئی نوکر ہے، چپ ہو گئی۔ ذرا گردن پھیر کر کنکھیوں سے دیکھا تو سفید پاجامہ، انگریزی جوتے نظر آئے۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی سامنے تین نوجوان کھڑے تھے۔ بیچ میں وہی تصویر والا انگوٹھی میں نگینہ نظر آتا تھا۔ میں نے سر سے پا تک ایک نظر ڈالی، دل کہے ٹھیر، دماغ کہے مناسب نہیں۔ شرم بھی شریک ہو گئی۔ میں جھمک کر چلی آئی۔ ملازم کو بلا کر دریافت کیا، معلوم ہوا

چھوٹے نواب صاحب حبیب میاں مع دوستوں کے تشریف لائے تھے، رات آنکھوں میں کٹی، صبح اسی حوض کے پاس پہنچی تو ایک پرچہ ملا۔ اس پر یہ شعر لکھا تھا

سیر کی خوب پھرے، پھول چنے شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

ساحرہ یہاں تک کہنے پائی تھی کہ کچھ اور دوست آ گئے اور سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

۱۱

برسات ختم ہو گئی تھی۔ ستمبر کا کراؤڈ (crowd) مسوری آ رہا تھا۔ پھر پہلی سی گھما گھمی تھی اور ویسی ہی پہل پہل
لیکن میرے دل کی نگری کچھ سوتی تھی — بار بار کاسنی
قول والے سادھو کی آواز کانوں میں گونجتی، اور پھر کسی پرانے
مقبرہ کی صدائے بازگشت کی مانند گنبد سر میں گھوم جاتی۔
— گوشِ دل تک آتی "کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا"
کہتی اور غائب ہو جاتی۔ یہ سرگم سے بچھڑا ہوا سم وادی
گاہ گاہ آس دے جاتا۔ زندگی کے راگ میں رس پیدا
ہو جاتا۔ پھیکے رنگ رہ جاتا۔

ہیک مین (Hakman) کی رونق بڑھ رہی تھی۔
سٹفلز (Stiffles) کا ہول (Hall) بھرا رہتا
رندانِ شب زندہ دار شام تمام رات شغل شاہد و شراب میں
گذار دیتے۔

آج سووے (Savoy) میں فینسی ڈریس بال

(Fancy Dress Ball) ہے۔ سب بہروپ[1] بدلے روپ دھارے آرہے ہیں۔ ہر ایک کی آنکھ پر سیاہ پٹی بندھی ہے، دراصل سماج کی نگہ عیب جو دامتیاز طلب پر اندھیری پڑی ہے —— اس بزم میں افتراق مراتب نہیں۔ رانی جوگن بنی ہے۔ راجہ، فقیر، رئیس گدا کے روپ میں ہے تو فقیر شاہ کے —— اس وقت کیوپڈ کا راج ہے، اور سب اندھا کام کاج۔

چدّر (چادر) چھپول ہورہی ہے۔ ساری آنکھ ہی کی شرم ہے۔ یہاں آنکھوں پر پہلے ہی پٹی بندھی ہے —— دل دادگان رقص آرہے ہیں، طوفان ترنم بپا ہے۔ بادہ گسار آرہے ہیں۔ جام چھلک رہا ہے، عشرت پرست جمع ہیں۔ سووے (Savoy) عشرت کدہ ہے۔

شیمپین (Champaigne) کھلی، کلارٹ (Claret) الٹ گئی۔ کوک ٹیل (cocktail)

---

[1] فینسی ڈریس بال میں سب آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر آتے ہیں تاکہ شکلیں نہ پہچان سکیں۔ اس پٹی میں آنکھوں کیلئے دو سوراخ ہوتے ہیں۔

گلاس ایک ٹانگ سے کھڑا ہے۔ بھیڑ کا یہ حال کہ کھوے
سے کھوا چھلے، نشہ کا یہ عالم کہ تہذیب لغزیدہ پا۔ ٹیپ[1] ڈانس
شروع ہوا۔ جس نے جس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا بس
سمجھیے ہاتھ دھر دیا۔ دوسرے کے چھوڑنے کی دیر ہے
اس کے آنے کی دیر نہیں، پیمانہ بھی گردش میں ہے —
پارٹنر بھی شراب آلود ہونٹ قریب جاتے ہیں بُعد نہیں۔
بار بار نادانستگی میں منقارِ بلبل برگِ گل سے جا ملتی ہے۔
سب اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ قیل و قال کا موقع نہیں
یہ وہ بہشت ہے جہاں کسے را باکسے کارے نیست۔
دلے برائے ہیچ کس بارے نیست — وریں ہنگامہ
عشق یک نفس وفادارے نیست۔ یہاں مجنوں بھی ہیں
فرہاد بھی، لیکن دشت نورد و کوہکن نہیں۔ یہاں لیلیٰ
نژاد بھی ہیں، شیریں نہاد بھی۔ لیکن پیکرِ عصمت نہیں، طلبگار
جوئے شیر نہیں۔ ایک گولڈ ڈگر (Gold Degger)

---

[1] اس ناچ کی یہ خصوصیت ہے کہ جس مرد نے دوران رقص میں جس عورت
کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اسے فوراً اس کے ساتھ ناچنا پڑتا ہے۔

ہے تو دوسری جوے مے کی جویا۔

عطروں کی خوشبو، شراب کے بھپکے۔ سیاہ ماحول میں سے نشیلی انکھڑیوں کے اشارے، جیسے شب تاریک میں پروانہ کو شمع کھینچے ـــ اس عالم رنگ و بو میں رنگین ساڑیاں، اس جہان کیف و مستی میں سرخوش جوانیاں ـــ قدم لڑکھڑاتے نظر بہکی بہکی بسمیوں سے سینے ملے۔ کوئی پردہ تھا، نہ حجاب تھا، گلاس لنڈھائے جا رہے تھے، جام عشق چھلکائے جا رہے تھے، بوتلیں خالی ہوتیں، گلاس بھرتے، گلاس خالی ہوتے، نشہ چڑھتے۔

ایک میز پر کوئی صاحب مرلی والے کا روپ دھارے گوپیوں میں گھرے بیٹھے تھے، رادھا پہلو میں تھی، تاہم ہر گوپی رادھا بن جاتی۔ میں نے آج انہیں مسوری میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن صورت کچھ ذہن میں پھر پھر جاتے۔ رادھا کو جو ذرا بہ نظر غور دیکھا تو بیگم لاڈلے۔ ادھر سرکار ہیں ماشاءاللہ میں ناچتے ناچتے ایک میز کے پاس سے گذری تو کامنی فول والا سادھو۔ قدم رک گئے، سانس ٹھہر گیا۔ نظریں جم کر رہ گئیں۔ پارٹنر نے اشارہ دیا۔ پیچھے سے سیل فتحال

چلا آرہا تھا، یہاں رُکنا محال ہے ـــــ چند قدم آگے ایک میز پر ایک نہایت خوب صورت نوجوان پریوں میں گھرا بیٹھا، جیسے گلفام اندر کے اکھاڑے میں۔ کٹیلی آنکھ، سجیلا بدن، باتوں میں ادا، دیکھنے میں موہنی۔ رنگ میدہ و شہاب، کسی یونانی بت تراش کے تراشیدہ خد و خال۔ کپڑوں میں خوش مذاقی۔ بیٹھک میں بانک پن۔ مردوں کی طرح پی رہا تھا۔ بھونرے کی زندگی جی رہا تھا۔ کبھی اس گل پر کبھی اس گل پر۔ یہ بھی کوئی نووارد تھے۔ قریب کی میز پر ایک جوگن بیٹھی تھی، میں پہچان گئی ساحرہ تھی۔ پاس جا کر میں نے کہا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اس نے آنکھ سے خموشی و راز داری کا اشارہ کیا ـــ

بینڈ بند ہوا۔ ناچ رُکا۔ بیلے ڈانسرز Ballet dancers آئیں۔ ہاتھوں میں دف، قلندرانہ روپ مستانہ ادا، اور یہ چیز گانی شروع کی

ڈھب یا جو رے آج ڈھب باجے
موج گل از در و دیوار چمن لبریز است

کشتیِ بادہ بیارید کہ گل طوفاں کرد

ڈھب باجو رے آج ڈھب باجو رے

تصورِ عرش پر اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

ڈھب باجو رے آج ڈھب باجو رے

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

ڈھب باجو رے آج ڈھب باجو رے

بنکار و آج خوب چلو میکدہ کو ذوق
چھوڑو کہیں وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

ڈھب باجو رے آج ڈھب باجو رے

فضا میں کیف و مستی تھی، آنکھوں میں سرور، دلوں میں خروش، در و دیوار جھوم رہے تھے۔ رندانِ مے آشام لب ساقی و جام چوم رہے تھے۔ صراحی پیمانہ پر جھک رہی تھی، پیمانہ صراحی پر۔ امتیازِ من و تو نہ رہا تھا۔ ناز نیاز سے بدل چکا تھا کہ اس جھرمٹ نے گانا بند کیا اور جوگن دوبارہ لے آئی۔ ظالم نے عجب درد بھری آواز میں یہ چیز گائی:

پیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت نہ کریو کوئے

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را
پیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا ....

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی
پیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا ....

عشق برے ہی دھیان پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا
پیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا ....

محفل میں سناٹا تھا، دلوں میں طوفان، طفلِ اشک آنکھوں میں مچل رہا تھا، آہِ سوزاں سینوں میں، جامِ اشکِ خونیں سے بھرا تھا۔ ہر ایک رند دل تھامے ہوئے تھا۔

گانے والی گا رہی تھی، دل کی آواز اہل دل کو سنا رہی تھی آہیں شہ بنی تھی آنسو راگ نفس کا ساز تھا اور غم کی مضراب۔
وہ گا کر چلتی ہوئی۔ بزم پر اک ہو کا عالم تھا کہ اتنے میں بینڈ بجا، اور ہم سب نے ناچنا شروع کیا۔ دل درد آشنا نے موسیقی میں غرق کر دیا گیا — ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی — میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سادھو جی غائب۔
گردش میں آدمی ہی آدمی تھے۔ ہال بھرا ہوا تھا، لیکن میرے دل و دماغ کی یہ کیفیت تھی، جیسے کوئی جنگل میں بھٹک جائے اپنوں سے بچھڑ جائے — اب محفل برخواست ہو رہی تھی، میں بھی اٹھی، سب جا رہے ہیں۔ تھکی ہوئی بیویاں میاؤں کے ساتھ۔ آزاد بیٹیاں باپوں کے ساتھ، دوست دوست کے ساتھ، محبوب محبوب کا ہاتھ پکڑے ہوئے، میرے عارضی ساتھی میرے ساتھ تھے، ابھی دروازہ تک پہنچی تھی، جو ساحرہ برابر سے نظریں بچا کر گذرتی نظر آئی۔ میں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ رکشا میں بٹھا ساتھ گھر لے آئی۔
صبح ہو رہی تھی، سورج بلندیوں کو روشن کرتا ہوا پستیوں

کی جانب رجوع کر رہا تھا۔۔۔ میں نے کہا: "ساحرہ! سرِ کوہ پہلے روشن ہوتا ہے، پائے کوہ بعد میں"۔ بولی: "یہ وہ جانے جسے سر و پا کا ہوش ہو۔ ہاں اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ روشن کنِ حیات جہاں پہلی کرن ڈالتا ہے، تمام دن اسے منور رکھتا ہے، اور پھر نگاہِ واپسیں بھی وہیں ڈالتا ہوا گزرتا ہے۔ دیکھ لو سرِ شام سرِ کوہ روشن ہوتا ہے، پائے کوہ نہیں۔

میں بولی: "لیکن یہ معشوقِ تابندہ رو رات بھر کے لئے غائب بھی تو ہو جاتا ہے۔ خدا معلوم کہاں کہاں جاتا، کس کس کے کلبۂ احزاں کو روشن کرتا ہے۔ یہاں دنیا اندھیر ہوتی ہے، اس کی فکر نہیں"۔

جواب ملا: "اس کی فکر کفر ہے۔ معشوق کا کام ہی یہ ہے، لیکن پھر آ تو جاتا ہے"۔

اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

لیکن وہ سورج جو نظریں پھیرے اور پھر نظر پھیر کر نہ دیکھے اس کا کیا کیا جائے۔

میں نے کہا: "اسے بھلا دینا بہتر"۔

ارشاد ہوا۔ شمع کی تو دل پروانہ سے کیونکر جائے
کیک کس طرح فراموش کرے چاندنی رات

میں نے کہا۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب تم شمع و پروانہ پر ایک شعر سنو اور داستان شروع کرو کہ دن کٹے۔ راتیں تو مسوری میں کٹ ہی جاتی ہیں ؎

برق در جان ہوا خواہی فانوس افتد
تا یکے شمع جدا سوزد و پروانہ جدا

ساحرہ نے اک آہ دل گداز کھینچی، اور کہا مجھے یاد نہیں، کہاں تک کہہ چکی ہوں" میں نے کہا پہلی مرتبہ دیدار ہوئے، صبح حوض کے کنارہ پرچہ ملا شعر لکھا تھا۔

سیر کی خوب پھرے پھول چنے شاد رہے
باغباں جانے نہیں گلشن ترا آباد رہے

اب ساحرہ نے سنانا شروع کیا: "ہاں تو دوسرے دن میں دیدارِ دی شب کے مزے لے رہی تھی، جو وہی صاحب آئے جن کے ساتھ میں گھر سے آئی تھی۔ پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کیں، پھر بولے" رات کو تو ہمارے چھوٹے نواب صاحب سے آپ کی مٹ بھیڑ ہو گئی۔"

میں نے کہا "جی ہاں، میں نے تکلف سامنے والے فوارہ پر بیٹھی تھی جو جھاڑیوں میں آہٹ سنائی دی۔ اٹھ کر کمرہ میں چلی گئی، بعد میں ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے نواب صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ تشریف لاتے تھے شاید ادھر ٹہلتے ہوئے نکل آئے ہوں گے۔"

بولے "اجی صاحب بڑی طویل داستان ہے۔ حکیم صاحب کے نسخہ پر عمل کیا جا رہا ہے، اور انہوں نے ملاقات یوں ہی تجویز فرمائی تھی۔"

میں نے ان کو سر سے پا تک دیکھا اور کہا "ماشاءاللہ"

بولے "انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلی ہی خوراک کارگر ہو گئی" ــــ میرے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے، لیکن خموش بیٹھی رہی۔ جانتی تھی کہ انہیں کام تو مجھ ہی سے لینا ہے۔ سارا ڈرامہ نہ سنائیں گے، مجھ سے پارٹ کیا ادا کروائیں گے۔

تھوڑی دیر خموش رہنے کے بعد بولے "آپ کی والدہ نے کچھ تو آپ کو بتا دیا ہوگا؟" میں نے کہا "جی نہیں آنکھوں پر پٹی باندھ آپ کے حوالہ کر دیا تھا کہ جس راہ

چلائیں اسی راہ چلنا:

مرزا صاحب ذرا مسکرائے۔ میں ان کو اول دن سے مرزا صاحب ہی کہتی تھی اور بولے ماشاء اللہ لکھنؤ کی تعلیم ہے، کیوں نہ ہو جیسا سنتا تھا، ویسا ہی پایا۔

میں نے کہا شکریہ، لیکن عرض یہ ہے کہ میری ماں نے سب کچھ سکھایا، وہ پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں بوجھنی نہ سکھائیں، یہ جناب کب تک معموں میں باتیں کئے جائیں گے مجھے الجھن ہوتی ہے۔

بولے "ہم سب ایک الجھن میں ہیں، اور وہ آپ ہی سلجھا سکتی ہیں"

میں نے کہا "لونڈی حاضر ہے۔ کاش یہ انگلیاں عقدہ کشا ثابت ہوں۔ کہیں رزق دنداں نہ نبیں۔

صد حیف کہ دانتوں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر انگشت

بولے "آپ بہت خوش ذوق ہیں۔ کیا برمحل استاد ذوق کا شعر پڑھا ہے" غرضکہ ذرا میدان تیار کرنے کے بعد وہ کھل گئے اور وہی داستان کہہ سنائی کہ چھوٹے نواب

صاحب کا دل ایک شریف خاتون پر آیا ہے۔ وہاں رسائی ناممکن۔ ناموس کے معاملہ درمیان، منہ سے بھاپ بھی نہیں نکال سکتے، چھریاں چل جائیں، تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں اور پھر انہیں قرار نہیں۔ ہم سب کچھ کر ہارے۔ لیکن ہنوز روز اول۔ وہی شب بیداری۔ وہی اختر شماری۔ رئیس گھر کا لڑکا ہے۔ ماں باپ کا اکلوتہ۔ آنکھ کا تارا۔ دل کا سہارا۔ لاکھوں کی جاگیر کا تنہا مالک۔ صورت آپ نے دیکھ ہی لی۔ اس کا کہنا ہی کیا، ماں باپ فکر میں گھلے جاتے ہیں۔ دھن دولت لٹانے کو تیار ہیں۔ خدا ان کے لڑکے کا دھیان بٹا دے۔

عالم رنگ و بو کی سیر کرائی۔ لیکن کوئی ایسی نہ ملی جو یاد محبوب دل سے بھلاتی۔ آخر نظر انتخاب تم پر پڑی، حکیم صاحب کہتا ہے کہ سوائے اس کے کوئی شوخ و شنگ ان کا دل موہ لے اور کوئی تدبیر ممکن نہیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا جا رہا ہے۔ بس یہ آخری آسرا ہے۔ پل پل کی خبر حکیم صاحب کو دی جاتی ہے۔ ان کی بغیر اجازت تنکا نہیں ٹوٹتا۔ حکم تھا کہ آتے ہی ملاقات نہ کرانا۔ یہ نہ کہنا کہ

آپ کا دل بہلانے آئی ہیں۔ احباب کی زبانی اڑتی اڑاتی خبر کان میں پڑ جاتا کہ ایک بڑے رئیس کی لڑکی باغ میں ٹھہری ہیں۔ ایک کہے ہم نے جھلک دیکھی، پری ہے پری — دوسرا کہے میں نے بہچ گاڑی میں بازار میں دیکھا، خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اکا کر پیچھے ہو لیا۔ اجی وہ تو اپنے ہی باغ میں جا اتریں۔ خدا گواہ ہے چاند کا ٹکڑا ہے اس دن سے دل بے قرار ہے۔ صبح شام باغ کے چکر لگاتا ہوں، پھر آج تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ ایسی قبول صورت موہنی مورت دیکھی نہ سنی بس یوں سمجھیئے۔ ؎

بصورت تو بے کمتر آفرید خدا
ترا کشیدہ دوست از قلم کشید خدا

غرض کہ اس ڈھب سے جذبات کو ابھار کر لاتیں۔ ایک سیہ بخت زلف کی تعریف کرے تو ایک روشن سواد رخ پُر نور کا ذکر چھیڑے۔ کوئی گل خوردہ گل رخسار کا رنگ جمائے پھر ایک سراپا عشق سراپا کہہ سنائے۔
طبیعت کو اس ترکیب سے مائل بہ دیدار کریں۔ پھر

چوری چھپے باغ میں جا پہنچیں، چاندنی رات لازمی تھی، جس طرح بن پڑے آپ کو دکھائیں۔ لگی ہیں اور لگائیں۔

داستان یہاں تک پہنچی تھی جو سامنے سے سادھو جی جاتے نظر آئے۔ ساحرہ بولی: "یہ عجیب کیریکٹر ہے۔" میں نے کہا: "مجھے ایک مرتبہ کامسٹی فول پر ملے تھے۔ میں یہ کہہ رہی تھی، جو حامد آ گئے، اور داستان فردائے شب پر ملتوی کر دی گئی۔

---

(۱۳)

گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے۔
میرے بھی دل کو لگی تھی۔ دوسرے ہی دن صبح خود ساحرہ کے
ہاں جا براجی یہ عقاب نظر انگلز نسٹ میں رہتی تھی۔ خادم
باتمیز نے دروازہ کھولا۔ ساحرہ سٹنگ روم میں کشمیری کام
کا ڈریسنگ گاؤن پہنے زلفیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ پر اداسی
تھی۔ رنگ میں زردی، آنکھوں کے حلقے بتا رہے تھے کہ رات
کو جاگی ہے، اور کچھ خوش کن حالات میں نہیں۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں نے
کہا اچھا تو پھر کیا ہوا؟ —— ہم دونوں کے دل میں ایک
ہی بات تھی، وہ فوراً سمجھ گئی۔ بولی خدا آپ کا بھلا کرے
اس عورت میں مشرق و مغرب کا امتزاج تھا۔ یورپین ماحول
میں خدا آپ کا بھلا کرے، ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی لعبت
یورپ انگیا، کرتی اور طاؤسی پاجامہ پہنے آجائے ——
—— یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

ساحرہ نے یوں کہنا شروع کیا "مرزا صاحب نے سارے حالات مجھ کو بتا دیئے۔ تمام نشیب و فراز دکھا دیئے یہ بھی کہہ دیا کہ چھوٹے نواب صاحب رات سے کئی بار آپ کا ذکر خیر کر چکے ہیں۔ بلکہ خاص احباب سے یہ بھی فرمایا کہ رات کو پھر سیر باغ رہے گی۔ آثار اچھے نظر آتے ہیں، کام بنتا دکھائی دیتا ہے۔ ماں باپ کی دعائیں شاید خدا نے سن لیں۔ بیگم صاحبہ بیٹے کو دیکھ دیکھ کر گھلی جاتی تھیں، اسے چپ لگی تھی اور یہ غریب ماسنا کی ماری سکتہ کے عالم میں۔ بیچاری کی ساری عمر کی کمائی بس یہی اکلوتا بچہ ہے، اور اب تو تم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، ان ہوئے کو پیار آئے، کیوں ہے نا لاکھوں میں ایک؟ بولو پسند آیا؟"

میں نے کہا "میکدہ کے گردش زدہ ساغر کو پسند ناپسند کا حق نہیں"۔ فرمایا "تصویر پھر یوں ہی طلب کی گئی تھی۔"
میں نے جواب دیا "تھا ایک انداز جنوں وہ بھی"۔

غرض مرزا صاحب تو یہ میٹھے بول کان میں ڈال "کہ شاید رات کو حضور ادھر آن نکلیں" چلے گئے۔ اتنی اور بتا گئے

کری کہ ذرا احتیاط سے کام لینا۔ اگر اس ڈرامہ کا ظالم کو
ذرہ برابر بھی پتہ چل گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ میں نے
کہا اللہ مالک ہے، اور دل کا مالک بھی اللہ ہی تھا۔
جوں توں کر کے شام کی۔ دس جوڑے پہنے اور اتارے۔
آخر چاند تاروں کی ساڑھی پر قرعۂ فال پڑا۔ اس کی یہ خصوصیت
تھی کہ معمولی ساڑھیوں کی طرح سارا کام ایک فاصلہ کا نہ تھا
بلکہ ہر حصہ پر اس کی مناسبت سے کام بنایا گیا تھا۔ مثلاً میروں
پر چھوٹے چھوٹے بہت سے ستارے تھے، جو گھل مل کر
کہکشاں کی سی کیفیت پیدا کرتے تھے۔ باقی گھیر میں ایک
ایک تارہ ایک ایک سے کامل تھا۔ پیچھے دو ستارہ تھے، جو
چلنے میں کبھی ڈوبتے کبھی چمکتے۔ سینہ پر سے جو پلو گذر رہا
تھا، اس پر دو ہلال بنے تھے جو سیب فردوس در دست نظر
آتے تھے۔ پلو پر آڑا چاند تارہ بنا تھا، جو پرچم ہلالی ہلاتا،
دعوت پیکار دیتا تھا۔ اور یہ سب کام آسمانی رنگ کے باریک
ریشم پر بنا تھا۔

غرضکہ میں چرخ سحر کار کا روپ دھار قسمت آزمانے
ہو بیٹھی۔ یہ کپڑے باغ کی سٹنگ (Settings) کے

لئے مناسب نہ تھے، اس لئے ڈرائنگ روم کی تمام روشنیاں
کھول کر ایک کرسی پر دروازہ کے سامنے فروکش ہو گئی۔
انتظار تھا، اور سخت انتظار، دل ہر آہٹ کے ساتھ دھڑک
جاتا۔ میں کنکھیوں سے سوئے باغ دیکھتی، اور پہلو بدل
بدل کر بیٹھتی تھی۔ دل کا ڈائرکٹر نادانستہ طور پر کچھ ریہرسل سی
کرا رہا تھا۔ کچھ چاپ سنائی دی اور میں پیکر حسن بن ہو بیٹھی۔
قدم قریب آتے معلوم ہوتے۔ میں نے نیچی نظروں سے
دیکھا تو مالی چلا آرہا تھا۔ منہ سے بے ساختہ نکلا

ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی

دل کو اپنے اپلے اڑھ مالی کا انتظار تھا، جو کشت امید
کی آبیاری کرے۔ کبھی سوچتی تھی رئیس زادہ ہیں ہزار مشاغل
خدا جانے آئیں نہ آئیں۔ اس خیال کے ساتھ مجھے سنگار
برا لگنے لگتا تھا۔ پھر خیال آتا کہ کئی مرتبہ میرا ذکر کیا ہے، خیال
تو ضرور ہے، ضرور آئیں گے، اس تخیل کے ساتھ ساتھ مجھے
اپنا سامان آرائش و زیبائش کچھ کم کم معلوم ہونے لگتا، جیسے
کسی غریب کے گھر کوئی رئیس آتے، وہ اپنا گھر سجائے لیکن
بے بضاعتی کا احساس برابر کھٹکا جائے۔

کوئی ساڑھے آٹھ بجے بیرہ نے آکر کھانے کی بابت
دریافت کیا۔ میں پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ آج کھانا موقوف
مبادا میں ڈائننگ روم میں ہوں، اور میرا شاہزادہ آجائے
اور پھر روح تشنہ نہ رہ جائے۔ کہہ دیا کہ کچھ سینڈوچز اور
دودھ بیڈروم میں رکھ دو۔ مجھے جب بھوک لگے گی کھالونگی
ـــــ آج بھوک کیسی، وہ آرہے ہیں، اور نہیں بھی آئیں
تو امید تو ہے۔

عشق عورت کے رگ و پے میں ہے، وہ محبت کرنے
پیدا ہوتی ہے۔ شریف زادی کی شرافت و حیا غالب آجاتی
ہے، رنڈی کا یہ جذبہ عریاں ہے۔

کوئی ۹ کا عمل ہوگا جو سامنے کی جھاڑیوں میں کچھ کھڑ
کھڑاہٹ سی سنائی دی۔ میرے احساسات جاگ اٹھے
جسم کو سوتا بنائے رکھا۔ میں چند لمحات ایک پیکر تراشیدہ
بنی بیٹھی رہی، لیکن جانتی تھی کہ مٹی کی مورتی کتنی ہی حسین کیوں
نہ ہو، اس سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ انسان کی حرکات و
سکنات نقش دوام چھوڑتی ہیں، میں نے جو چوٹی بے پروائی
کے انداز سے سینہ پر ڈال رکھی تھی، اس سے کھیلنے لگی۔ پھر ایک

کتاب اٹھالائی، کچھ دیر اسے دیکھا، یقین جانیے صفحے صاف نظر آتے تھے، یہاں دل میں کتابِ عشق کھل چکی تھی۔ دل خمریاتِ عشق کے مزے لے رہا تھا۔ کچھ اس فلک سیری ساڑھی کا بھی نشہ تھا، ورقِ زندگی الٹ رہا تھا۔ ہاں چند اوراقِ قرطاس گردانتی ضرور رہی۔ اس کے بعد اپنی پوری دراز قامتی کے ساتھ دروازہ میں جا کھڑی ہوئی۔ ہاتھ رخِ روشن کے گرد ہالہ کیے چوکھٹ پر ٹکے تھے، پھر برآمدے میں اس رنگین زاوی کے انداز سے ٹہلنے لگی، جیسے وقت گذارنے کا کوئی مشغلہ نہ ہو اور مہ و سال ٹھکراتی پھرے۔ کبھی ساڑھی کو جھٹکا، کبھی پلو سنبھالا۔ برآمدہ کے کٹہرے پر سینہ جھکا کھڑی ہو گئی، نفس مدعا یہ کہ اس کیوپڈ کی شاگردی نے سارے تیر چلاتے، اور ایک عرصہ تک یہ تفنگ ہائے عشق نگاہوں سے اوجھل نشانہ پر آزمائے جاتے رہے۔

یہ رات میں نے اس دوشیزہ کی سی کاٹی جس کے دل کی کلی پہلی بار کھلی ہو۔ کبھی پھولوں کے بستر پر تھی، گاہ کہکشاں کی سیج پر۔

صبح مرزا صاحب تشریف لائے۔ رات کی کامیابی پر

مبارک باد دی۔ میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا، اور کہا
آپ کیا فرما رہے ہیں؟ رات کو تو وہ تشریف نہیں لائے،
جواب ملا "آپ کو خبر نہیں وہ تو گھائل ہو کر گئے ہیں۔ بے خبری
کے ناوک نشانہ پر لگے، شکار فتراک سے بندھا کہئیے۔ اب
تو اُدھر رسائی کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ تدبیر
یہ ہے کہ مالی کا برتن بھر کر گلِ امید کھلائیں۔ اندھیرے مُنہ
باغباں کی طلبی ہوئی تھی۔ کچھ ضروری ہدایات کی گئی ہیں، نیز
رازداری کی تاکید بھی ہے۔ ہاں میں بھولا۔ بڑی بیگم صاحبہ
لتے۔ اب میں انہیں بڑی بیگم صاحب ہی کہوں گا، کیونکہ چھوٹی
بیگم صاحبہ آتی نظر آ رہی ہیں؛ یہ کہہ کر انہوں نے معنی خیز نظروں
سے میری طرف دیکھا، اور فرمایا "بڑی بیگم صاحبہ نے آپ کا
شکریہ ادا فرمایا ہے، اور کہا ہے کہ ساری عمر احسان مند رہوں گی
میرے بچے کی زندگی تمہارے ہاتھ ہے۔
میں نے کہا اس لونڈی کی جانب سے دست بستہ عرض
کر دیجئے گا اور فرمائیے گا کہ خدا کا بھروسہ ہے اور آپ کی
دعاؤں کا سہارا۔
مرزا صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ اور میں نے

مالی کے لئے چشم براہ ہو بیٹھی — کوئی پارہ کا عمل ہوگا جو میں ٹہلتی
ٹہلتی باغ میں جا نکلی، ذہن میں تجسس تھا، آنکھوں میں تفتیش،
دل میں انتظار — میری نگاہیں ہر چہار جانب مچلتی پھر رہی
تھیں کہ ایک درخت کے نیچے سفید کرتہ پہنے کنٹی کی دھوتی
باندھے سرو قامت نرگسی چشم گل رخسار مالی بیٹھا نظر آیا —
پودے پر اناڑی پنے سے کھرپا مار رہا تھا۔ ہر چوٹ دل
پر لگتی، اور شجرِ حیات جھکولے کھا جاتا۔ خیابانِ زندگی دہک
اٹھتا۔ ہاتھ کام کر رہا تھا۔ نگاہیں ڈانواڈول تھیں۔ میں ایک شجر
کے پیچھے کھڑی محوِ حیرت دیکھ رہی تھی، دل اس کے قدموں
میں لوٹ رہا تھا، نگاہیں اس سراپا حسن کی بلائیں لے رہی تھیں۔
میرا کوہ کن مصروفِ کار تھا، اور میرے دل سے جوئے عشق
رواں۔ میں اس کی جانب شجر شجر، روش روش کھنچی چلی گئی۔
عقل قدم پکڑے لے، دل کھینچے لئے جائے۔ ابھی اس کے
پاس پہنچنے نہ پائی تھی جو آنکھیں چار ہوئیں۔ قدم لڑکھڑا گئے۔
زمین پیروں تلے سے کچھ اس طرح سرکی کہ میں بلا ارادہ اس
مالی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔
رئیس کا لڑکا، مالی کا پارٹ کیا جانے، کچھ بوکھلا سا گیا۔ پہلے

سلام کو ایک ہاتھ اٹھایا، پھر دونوں ہاتھ ملا کر ویلی زبان سے کہا "نمستے"۔ میں اب سنبھل چکی تھی، گردن کے اشارے سے سلام لیا۔ مرد کے اعصاب ایسے مواقع پر مجبوب پڑ جاتے ہیں۔ لیکن عورت سبک روی سے گزر جاتی ہے۔ میں نے پھر سکوت توڑی، اور کہا "تمہارا پرانا مالی کہاں گیا۔" جواب ملا "حضور وہ بھی ہے"۔ میں نے کہا "تم کب سے نوکر ہوئے ہو؟" بولا "سرکار کل سے"۔ میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟" اس کے جواب میں ایک سسکاری کی آواز آئی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو انگلی لہو لہان ہو رہی ہے، کھرپا لگ گیا۔ زلیخا کو دیکھ یوسف نے انگلی قلم کر لی۔ میں تڑپ گئی، لیکن طبیعت کو قابو میں رکھا۔ فوراً نل پر انگلی دھلوائی، اپنا رومال بھگو کر باندھا۔ پھر بھی خون نہ تھما، کمرہ میں سے بوڑی کولون کی شیشی لا انگلی پر الٹ دی۔

دل چاہے گلے سے لگا لوں، عقل کہے خبردار! —

تو تنکہ پتنگ بڑھتے گئے۔ مچھلی کی جائی کو تیرنا کون سکھائے اور رنڈی کی لڑکی کو عشق کی گھاتیں، محبت کی باتیں کون پڑھائے ادھر بھی ہوا دینے والے سکھاتے پڑھاتے ہزار خواہ بہتیرے تھے۔ ادھر تو سلاگ ہی رہی تھی، چنگاری کو شعلہ بنتے دیر نہ لگی۔

جذبات نے انگلی پکڑ راہ دکھائی، مالی کے بہروپ نے خوب گل کھلائے۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ روزانہ دیدار بازی ہوتی۔ گاہ گاہ بیگم صاحبہ مالی سے بہ اندازِ خسروانہ بات بھی کر لیتیں۔ وہ البیلا الھڑ قدم بڑھانا نہ جانے — سمجھے پوزیشن کا خیال مانع۔ دل کہے حفظ مراتب بالائے طاق، گلِ امید کھلا بھی لے، آرزو کا دستہ سجا بھی لے عقل قدم روکے ہر گام پر ٹوکے۔ جلدی اچھی نہیں، ابتدا میں غلط اثر پڑ گیا تو کام بگڑ جائے گا، ساری عمر کو الاہنا رہے گا کہ لو صاحب مالی پر مری تھیں۔ آگے چل کر نظروں سے گر جاؤں گی، ہو چھورے ایسی کا کیا اعتبار، اچھی خاندانی ہیں، نک سک سے درست۔ مالی کے لونڈے پر پھسل گئیں۔

مرزا صاحب آستہ بولے۔ اب کیا دیر ہے، اتنی نہ کھینچو کہ رشتۂ الفت ٹوٹ جائے۔ گرم لوہا ہے، اس وقت ڈھال لو۔ عمر بھر کو تمہارا ہو رہے گا۔ ان معاملات میں عورت کی عقل مرد سے زیادہ دور رس ہوتی ہے۔ میں نے اونچ نیچ سمجھائی، وہ بھی میری سوجھ بوجھ کے قائل ہو گئے بولے اچھی بات ہے۔ یہ بیڑہ بھی بہ احسن الطریق اٹھایا

جائے گا۔

ایک دن بڑے نواب صاحب نے ٹی پارٹی دی شہر کے سب معززین جمع ہوئے۔ میں بھی بلائی گئی۔ آج پیرزمین پر نہ پڑتے تھے۔ چھوٹے نواب صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے والد نے جب ان کا تعارف مجھ سے کرایا، غریب کو پسینے آ گئے۔ میں نے بھی بار بار نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کچھ گھبراہٹ کا ایکٹنگ کیا، کچھ تعجب و پریشانی کا۔ برابر کرسی رکھی تھی، اس کی پشت کا سہارا لیا۔ جیسے پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہو۔ بڑے نواب صاحب نے بہ نگہہ غلط انداز میرا ایکٹنگ دیکھا، ہزاروں تعریفوں کے ساتھ میرا تعارف کراتے رہے۔ فرضی مرحوم دوست کی بیٹی بتایا۔ کہا: "بیٹا! ان کے والد سے میری دانت کاٹی روٹی تھی۔ چوبیس گھنٹے کا ساتھ خدا بخشے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، جب سے وہ نہیں رہے زندگی میں ایک مستقل کمی محسوس کرتا ہوں۔ اب ان کی یہ نشانی رہ گئی ہیں۔ میں نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔ باغ میں ٹھیرا رکھا ہے، تم بھی ان کے پاس جایا کرو۔ ہم دونوں مٹی کے بت بنے کھڑے تھے، ان کی آنکھیں تو زمین میں گڑی تھیں، زبان

ملتی نہیں، نواب صاحب ہم دونوں کو ایک میز پر بٹھا کر چلے
گئے۔ خموشی کی طوالت اب معنی خیز ہوتی جاتی تھی۔ مجھے
اس منزل سے گزرنا تھا، ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ
ہوں ہاں کرتے رہے، دل پر بوجھ تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی۔
جس بات کا کھٹکا ہو اگر وہ پوری طرح سامنے آجائے تو
اتنی ہیبت ناک نہیں رہتی۔ آخر میں نے آہستہ آہستہ ڈور
دینا شروع کیا۔ پہلے باغ کا ذکر چھیڑا۔ ان کے اعصاب
جھٹکے کے لئے تیار ہو گئے، پھر بوڑھے مالی کی تعریف
کی۔ آخر نفس مدعا پر اتر آئی۔ اور کہا جب آپ کو پہلی مرتبہ
دیکھا تو میں بوکھلا گئی۔ معاف فرمایئے گا۔ آپ کے باغ
میں ایک مالی جناب کا ہم شکل ہے، آپ نے دیکھا ہوگا۔
بولے میں ایک عرصہ سے باغ گیا نہیں۔ میں نے کہا آپ
تشریف لائیں گے تو میں ضرور دکھاؤں گی، بعینہٖ آپ کی
تصویر ہے۔ میری رائے میں تو آقا اور ملازم کا اتنا ہم شبیہ
ہونا کسی طرح مناسب نہیں، اسے الگ کر دینا چاہیے، فرمایا
آپ کی رائے بالکل درست ہے۔ اسے دو تین مہینہ کی تنخواہ
دے کر الگ کر دیا جائے گا —— اب وہ ذرا کھلے تو چلے۔

دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا۔ میں نے کہا چائے میرے
ساتھ پیجئے گا۔ ابھی لاسہ پر لگا کر لانا چاہتی تھی، احتیاط آگے
برت لی جائے گی، ہزار موقع ہیں۔

کہاں تک بیان کروں۔ قصہ مختصر کچھ ڈھیل دی کچھ
کھینچی، آخر اُدھر سے اظہار عشق ہوا، ادھر سے اظہار تعجب
زبان کہہ رہی تھی، آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ادا کہتی تھی، کہے
جاؤ۔ یہ الفاظ شربت و شراب ہیں۔

انہوں نے میرا ہاتھ ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے چھڑایا
نہیں، لیکن آگے بڑھنے نہ دیا۔ چلتے ہوئے ایک پھول توڑ
دے دیا، اور کہا میری یاد تم کو دلاتا رہے گا۔ اور بھاگ
گئی ——— دوسرے دن ذرا شرماتی ہوئی ملی۔ ان کی ہمت
بڑھ چکی تھی۔ میں نے منزلیں مقرر کر رکھی تھیں، کچھ وہ تیز
گام چلے کچھ میں نے منازل کم کر دیں۔ غرض دو دل ایک
ہو گئے۔ نکاح کا سوال بڑے نواب صاحب نے رد کر دیا
حجابات محبت نے اٹھا دیئے۔ قانونی اور شرعی بندھن
کوئی تھا نہیں۔ لیکن دو دل ایک تاگے میں گندھے تھے۔ یہاں
ذرا سی چوک ہو گئی۔ کچھ دل کا کہا کیا کچھ دلدار کا۔ ایک دفعہ گر کے

ابھر نہ سکی، جب ذرا سنبھلوں دل کہے دیوانی کہیں ہاتھ سے نکل جائے۔ کہیں اور نہ گھر جائے۔ دل مضبوط کروں، پر جب بھی وہ نشیلی انکھڑیاں دیکھوں تو ہم ڈگمگا جائیں۔

ایک عرصہ یوں ہی گذرا۔ پیار عشق کبھی اور کبھی ہم۔ آخر زیر عشق مقدر تھا۔ پنچھی ادہر ادھر اڑنے لگا۔ مرد باز صفت ہے قید کیا نہیں جا سکتا۔ شاہین بچہ شکار و پرواز سیکھ چکا تھا، اڑ نکلا۔ میری خودداری برداشت نہ کر سکی۔ بہو بیٹیاں لاج پر مرتی ہیں۔ میری راہ میں وہ تھی نہیں۔ آخر اپنی راہ لی — زخم بھر گئے لیکن اب بھی کسک جاتے ہیں۔ یہ ہے میری داستان اور یہ ہے میرا قصہ۔

ساحرہ نے اپنی بیتی سب سنا دی، آدمی کچھ لیتا ہے تو کچھ دیتا بھی ہے، اس کی آنکھیں مطالبہ کر رہی تھیں۔ کچھ میرا پیمانۂ ذہن بھی چھلکا جاتا تھا۔ آخر میں نے سب کہہ سنائی۔ اب ہم ایک دوسرے کے ہمراز بھی تھے، اور ہمدرد بھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ لڑتے ہوئے دل ملاؤں گی۔ بچھڑے ہوئے ایک جا لاؤں گی۔ ساحرہ سے ان کا نام دریافت کیا۔ معلوم ہوا محسن میاں کہلاتے ہیں۔

میں نے اپنے یہاں پارٹی دی، ساحرہ اور محسن کو بھی بلایا۔ انجان بن کر تعارف کرایا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ادھر بھی بچپن کی چوٹ ٹیس دے رہی ہے۔ دو چار مرتبہ محسن سے ساحرہ کا ذکر کیا۔ کہا عجیب لڑکی ہے کسی سے پر دیاں ہی نہیں ملاتی۔ قعر دریا سے بغیر دامن تر کئے گذر جاتی ہے، فلاں شہزادی نس کو دھتکار دیا۔ فلاں راجہ صاحب کو ٹھکرا دیا۔ کچھ بھید نہیں کھلتا۔ آخر قصہ کیا ہے؟ ہزار طرح پوچھا پر پتہ نہ چلا۔ میں سمجھتی ہوں کہیں چوٹ کھائی ہے ——— مرد ان معاملات میں زیادہ ضبط نہیں کر سکتا۔ میاں محسن آخر پھوٹ پڑے۔ بولے صاحب وہ یہی ناچیز ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان کو اس قدر تعلق خاطر ہے۔ میں نے بالاصرار سارا قصہ سنا، وہی تھا جو ساحرہ کہہ چکی تھی۔ دو جنے راضی تھے۔ آخر قاضی بھی آ ہی گیا۔ اور یہ کار خیر میرے گھر پر ہوا۔ سادھوجی بھی تشریف لائے۔ ساحرہ نے کہا: "میرے مہربان ہیں۔ میری نگاہ میں یہ چیز خاص طور پر آئی کہ سادھوجی مجھ سے آنکھ نہ ملاتے تھے۔ نیز ساحرہ میں اور ان میں میری بابت کچھ یک فہمی معلوم ہوتی تھی، میں نے

بار بار ان دونوں کی نگاہیں ملنے کے بعد یک وقت اپنی
جانب آتی ہوئی دیکھیں۔
ایک دن ساجدہ نے مجھے کھانے پر بلایا۔ اِدھر اُدھر
کی باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں اس نے قصہ چھیڑ دیا
کہ ایک صاحب جنگ پر گئے تھے۔ وہاں سے ان کے
مرنے کی خبر آئی، وہ صرف زخمی ہوئے تھے۔ زندگی تھی، بچ
گئے۔ دشمن کے نرغہ میں سے عجب طرح سے نکلے۔ کہیں کچھ بھیس
بدلا، کہیں کچھ۔ آخر وطن پہنچے۔ ہیڈ کوارٹر میں افسر کو سارا ماجرہ
کہہ سنایا۔ اس نے جواں مردی اور ہوشیاری کی تعریف کی
بولا جنگ تو ختم ہو چکی ہے، اب تم کیا کام کرنا چاہتے ہو؟
انہوں نے اپنے کو دشمن کے جاسوسوں کا پتہ لگانے کے لئے
پیش کیا۔ یہ جماعت ابھی تک بڑی تعداد میں موجود تھی۔
افسر نے تجویز پسند کی۔ یہ کام کرنے لگے۔ درحقیقت انہیں
ساتھ کے ساتھ ایک اور بھی تفتیش کرنی تھی۔ بات یہ تھی کہ
ان کی بیوی چند در چند وجوہ کے تحت سوسائٹی میں ملنے
جلنے لگی تھی۔ ان کو یہ ٹوہ لگانی تھی کہ وہ کن حدوں تک گئی ہے
آخرکار اپنا یہ اطمینان کر لیا کہ یہ عصمت پرور دہ وفا شعار

شوہر کی یاد سینے سے لگائے ہے، خیال آشیاں بندی
تو کیسا کسی شاخ کی جانب نظر بھی نہیں ڈالتی۔ اب وہ اپنی
بدگمانی پر نادم ہیں، اور نظر عفو کے امیدوار — اتنا
کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا قمر بہن معاف کر دوگی۔ میری
آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ سرفراز دوسرے کمرے
میں سے سوٹ پہنے ہوئے برآمد ہوئے۔

ساحرہ چلی گئی۔